بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

جلد نمبر۲ | شمارہ نمبر۱ | جنوری ۲۰۱۰ء، محرم الحرام ۱۴۳۱ھ

مضامین	مضمون نگار	صفحہ نمبر
ارض مقدس اور مسلمان (اداریہ)	بلال عبدالحی حسنی ندوی	۲
ایمان کامل کی ضرورت	مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ	۵
قوت ایمانی کی ضرورت	مولانا محمد واضح حسنی ندوی	۶
مسائل کے حل کے لیے سیاسی اور فوجی طاقت ضروری ہے	مفتی راشد حسین ندوی	۹
ارض مقدس-قرآن کریم کی روشنی میں.....	عبدالسبحان ناخدا ندوی	۱۱
جہد مسلسل یا جہاد و قربانی	محمود حسن حسنی ندوی	۱۴
قرآن-ارض فلسطین اور یہود	سمعان خلیفہ ندوی	۱۷
ارض فلسطین-ماضی اور حال کے آئینہ میں	محمد نفیس خاں ندوی	۲۱

مرکز الامام أبي الحسن الندوي

سرپرست

حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
(صدر، دارِعرفات)

نگران

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ
(جنرل سکریٹری، دارِعرفات)
مولانا احمد علی حسنی ندوی مدظلہ
(ڈائریکٹر، دارِعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی
مفتی راشد حسین ندوی
عبدالسبحان ناخدا ندوی
محمود حسن حسنی ندوی
محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

مرکز الامام أبی الحسن الندوي دار عرفات ،تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی) ۲۲۹۰۰۱
Email. alnadwi@yahoo.com فیکس نمبر 05352211188

فی شمارہ:۱۰ روپئے سالانہ: ۱۰۰روپئے

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ''پیام عرفات''، مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ارض مقدس اور مسلمان

عالمی منظر نامہ پر مسلمانوں کے زوال کے بعد سے مسلمان مختلف مسائل سے ہمیشہ دوچار رہے ہیں، یہ مسائل مختلف ملکوں میں مسلمانوں کو پیش آئے ہیں، اور مختلف زمانوں میں مسلمانوں کو ان سے سابقہ پڑا ہے لیکن مسئلہ فلسطین ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے اثرات عالمی بھی رہے ہیں اور ہمہ گیر بھی، اور پوری اسلامی دنیا اس کی کسک محسوس کرتی رہی ہے، اور شاید ہی کوئی بدقسمت مسلمان ایسا ہوگا جس کے دل میں اس کی چبھن نہ ہو۔

مسجد اقصیٰ مختلف پیغمبروں کی یادگار رہی ہے، مسلمانوں کے لیے اس کو قبلہ اول کی حیثیت حاصل رہی ہے، معراج کے موقع پر آنحضرت (ﷺ) کی پہلی منزل وہی تھی وہیں آپ (ﷺ) نے انبیاء علیہم السلام کی امامت فرمائی تھی، اس سرزمین کے بارے میں قرآن کریم نے سراپا برکت ہونے کی گواہی دی ہے، مسلمانوں کی اس سے جذباتی وابستگی ایک فطری چیز ہے۔

اسلامی تاریخ کا وہ دن بڑا نامبارک تھا جس دن ترک ناداں نے خلافت کی قبا چاک کی تھی، اس کے بعد مسلمان تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئے، رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہی، اسی دن سے قبلہ اول پر صہیونی پنجے گڑنے شروع ہوگئے تھے۔

ایک دن وہ بھی تھا کہ جب چند یہودی سلطان عبدالحمید کے پاس سفارش لے کر حاضر ہوئے تھے اور انہوں نے فلسطین میں رہائش کے لیے تھوڑی زمین کا مطالبہ کیا تھا تو سلطان نے زمین سے ایک چٹکی مٹی لے کر کہا تھا کہ میں تو وہاں اس کے بقدر دینے کو بھی تیار نہیں لیکن جب

ع خلافت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک

یورپ نے ایک بنی بنائی سازش کے تحت یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کا کام شروع کیا، یہودیوں کی غیر انسانی حرکتوں نے پورے یورپ کو مصیبت میں ڈال رکھا تھا، ہٹلر نے عاجز آکر وہ انتہائی قدم اٹھایا تھا، جس کی بنا پر وہ ضرب المثل ہوگیا، ان کی ظالمانہ اور شاطرانہ چالوں کو جاننے کے لیے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے، ہر ملک میں انہوں نے انسانیت سوزی کے لیے ایسی ایسی چالیں چلی تھیں کہ عام انسانوں کے لیے وہ ناسور بن کر رہ گئے تھے، اور یہ سب کچھ اتفاقی نہ تھا، ان کے پروٹوکول (Protocol) میں یہ سارے حقائق اصولی طور پر موجود ہیں، وہ خود کو خدا کی اولاد اور خدا کا محبوب سمجھتے رہے ہیں اور باقی ساری دنیا ان کے نزدیک ان کی غلام ہے، ان کی سازش یہ تھی کہ غیر یہودیوں کو ہر لحاظ سے ایسا پست کردیا جائے کہ دنیا ان کی غلامی پر مجبور ہوجائے، یہ ایک پورا پلان (Plan) تھا جس کو پورا کرنے کے لیے وہ ساری صلاحیتیں صرف کررہے تھے، اور آج بھی وہ اس میں مصروف عمل ہیں۔

یورپ کو ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی تدبیر نہ سوجھی تو اس نے یہ باور کرایا کہ فلسطین یہودیوں کی میراث ہے، ان کو وہاں حصہ ملنا چاہیے، اس طرح آہستہ آہستہ یہودیوں کو وہاں آباد کیا جانے لگا، اس کے یورپ کو دو فائدے ہوئے، ایک تو ان کی شاطرانہ چالوں سے امن ہوا، دوسرے یہ کہ مصیبت مسلمانوں کے سر تھوپ دی گئی۔

۱۹۲۰ء میں باقاعدہ انگریزی ہائی کمشنر کے ذریعہ ان کی ملکی حکومت کا اعلان ہوا، اس کے بعد سے انگریزوں کی سرپرستی میں یہودیوں نے اپنے قدم مضبوط کرنے شروع کیے اور وہ دنیا کے مختلف ملکوں سے وہاں آکر آباد ہونے لگے، جب ان کی تعداد بڑھی اور انہوں نے اپنے شاطرانہ مزاج کے مطابق بال وپر نکالنے شروع کیے تو مسلمانوں سے ان کی کشمکش شروع ہوئی، پھر ۱۹۲۸ء سے خونریز فسادات کا سلسلہ چل پڑا۔

۱۹۴۸ء میں باقاعدہ ''حکومت اسرائیل'' کے قیام کا علان کردیا گیا اور یہودیوں نے کئی عرب ریاستوں پر قبضہ کرکے اپنی حکومت قائم کرلی۔

۹/جون ۱۹۶۷ء کا دن مسلمانوں کے لیے روز بد بن کر آیا، اس دن تمام مسلمانوں کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور یہودی فوجیں بیت المقدس میں داخل ہوگئیں، آٹھ سو سال کے بعد یہ پہلا نامبارک دن تھا کہ مسلمان مسجد اقصیٰ میں جمعہ کی نماز ادا نہ کرسکے، وہ دن ہے اور آج کا دن، کشمکش جاری ہے اور اسرائیل کو بڑی طاقتوں کی طرف سے بھرپور پشت پناہی حاصل ہے۔

یہودیوں نے پہلے دن سے طے کرلیا تھا کہ اگر ہمیں دنیا پر حکومت کرنی ہے تو دو چیزوں پر پوری طرح قبضہ کرنا ہوگا، ایک اقتصادی نظام پر، اور

دوسرے ذرائع ابلاغ (Media) پر، اپنے اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے انہوں نے ہر طرح کی شاطرانہ چالیں چلیں اور آہستہ آہستہ وہ دنیا کے اقتصادی نظام پر حاوی ہوتے چلے گئے، آج امریکہ کے بڑے بڑے بینک ان کے قبضہ میں ہیں، اور دنیا کے اہم اخبارات انہوں نے خرید رکھے ہیں، کوئی خبر عالمی سطح پر ان کی مرضی کے بغیر چھپ نہیں سکتی، امریکہ جس کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت کہا جاتا ہے، اس کے کلیدی عہدوں پر یہودی یا خالص یہودی ذہنیت رکھنے والے عیسائی قابض ہیں، آج امریکہ کا بڑا طبقہ ان سے پریشان ہے لیکن بے بس ہے اور امریکہ کے مقننِ اول کی بات حرف بحرف پوری ہو رہی ہے کہ اگر تم نے یہودیوں کو یہاں بسنے کا موقع دیا تو ایک دن وہ آئے گا کہ وہ آقا ہوں گے اور تم ان کی غلامی کر رہے ہو گے۔

اسرائیل کی کسی ہزیمت کو امریکہ برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے، اس کے لیے سارے سرکاری پروٹوکول اور عالمی معاہدہ دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، عالمی قوانین کی دھجیاں بکھیر دی جاتی ہیں اور وہ سب کچھ روا رکھا جاتا جس کا دوسرے کے لیے تصور بھی ممکن نہیں۔

یہودیوں کے منصوبے میں ایک وسیع ''مملکت اسرائیل'' کا قیام بھی ہے جس میں دنیا کے اہم اسلامی ممالک خاص طور پر شامل ہیں، حجاز مقدس کا بڑا حصہ بھی اس میں شامل کیا گیا ہے، یہودی اپنے اس منصوبہ کو پورا کرنے کے لیے ہر طرح سازشیں کرتے رہتے ہیں، ان کے لیے نہ کوئی اصول ہے اور نہ انسانیت کی ان کے یہاں کوئی حقیقت ہے، ہر زمانے میں نبیوں کو قتل کرنے والے وہ ہیں، حضرت عیسیٰؑ کو اپنے خیال کے مطابق سولی پر چڑھانے والے وہ ہیں، عیسائیوں کے ساتھ ان کی طویل طویل خونریز لڑائیوں کی داستانیں تاریخ میں موجود ہیں، وہ کسی کے ہوئے اور نہ ہوں گے، اپنے فائدہ کے لیے ہزاروں کی جان لے لینا بلکہ ملکوں کو تباہ کر دینا ان کے لیے معمولی بات ہے۔

ایسی صورتحال میں اگرچہ وہ اس وقت مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں لیکن ہر ایک کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، قبل اس کے کہ اسرائیل اس کی مجبوری بن جائے پھر کچھ بنائے نہ بنے۔

اسرائیل امریکہ کی مجبوری ہے اور امریکہ اس وقت دنیا کی بڑی طاقت ہے، اس لیے بہت سے ملک اسرائیل کی ہمنوائی پر مجبور ہیں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسی کے گھر پر زبردستی قبضہ کر لے اور جب گھر کا مالک اپنی جگہ کا مطالبہ کرے تو اس سے وہ معاملہ کیا جائے جیسے وہ کسی دوسرے کے گھر کا مطالبہ کر رہا ہو۔

اسرائیل فلسطین کا حصہ تھا، اس پر زبردستی قبضہ کیا گیا پھر اگر ایک فلسطینی اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بہت بڑا جرم ہے، اگر وہ بے چارہ چند ڈھیلے پھینک دے تو وہ ظالم ہے اور اگر ان کی آبادیوں کی آبادیاں تباہ کر دی جائیں تو اس مین کوئی حرج نہیں۔

ایک عرب صحافی فلسطین کے اپنے ایک تازہ دورہ کی رپورٹ میں لکھتا ہے: ''غزہ پٹی کے دورہ میں میں نے دنیا کی سب سے بڑی جیل کا مشاہدہ کیا، پورے غزہ کو فولادی دیواروں اور ایسے تاروں سے گھیر دیا گیا ہے جن میں کرنٹ دوڑ رہا ہے، لاکھوں انسان اس میں قیدی کی زندگی گزار رہے ہیں، لیکن ان کو قیدیوں کے حقوق بھی حاصل نہیں، ایک قیدی کو بھی کھانے پینے، اور دوا علاج کی سہولت حاصل ہوتی ہے لیکن غزہ کے قیدیوں کو کوئی حق حاصل نہیں ہے، ہر طرف سے ان کو گھیر دیا گیا ہے، اسرائیل کے جاسوسی طیارے مستقل نگرانی کرتے ہیں رہتے ہیں۔

صرف اس لیے کہ انہوں نے آزادی کے ساتھ اپنا انتخابی حق استعمال کرتے ہوئے حماس کو ووٹ دیا تھا، دو سال سے یہ سلسلہ جاری ہے، اسرائیل چاہتا تھا کہ وہ اسی میں گھٹ گھٹ کر مر جائیں مگر ایسا نہ ہو سکا تو اس نے راکٹوں سے حملہ کیا، کم از کم چودہ سو اس میں شہید ہو گئے اور دس ہزار سے زائد زخمی ہوئے جن میں اکثر عورتیں اور بچے ہیں۔

وہاں مسجدیں، مدرسے، اسپتال اور یونیورسٹیاں کھنڈرات میں تبدیل ہو ہو چکی ہیں، صہیونی نظام کی داستانیں چپہ چپہ پر دکھائی دیتی ہیں۔

لیکن انسانیت دم توڑ رہی ہے، آنکھوں کا پانی مر چکا ہے، انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں آہنی شکنجوں میں ہیں، آزادی کا نعرہ لگانے والے انسانوں کو غلامی کے غار میں ڈھکیلنے کے لیے کمربستہ ہیں، کسی کے منہ میں زبان نہیں جو کھولے اور اگر کھولے بھی تو سننے والا کون ہے اور پہنچانے والا کون ہے، میڈیا کس کے ہاتھ میں ہے

ع ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مگر یہ ہوا کیسے؟! جن لوگوں کو دینے کے لیے پیدا کیا گیا تھا، آج وہ کیوں دوسروں کے سامنے کاسہ گدائی لیے کھڑے ہیں، جو دنیا کی کل آبادی کا چوتھائی کہے جاتے ہیں، آج وہ دنیا کے منظر نامے پر صفر کیوں ہیں، جنہوں نے دنیا کو جہالت و درندگی سے نکال کر علم و ہنر سے بھر دیا تھا، جنہوں نے انسانوں کو انسانیت کا سبق پڑھایا تھا، اور انسان کی طرح جینا سکھایا تھا، آج دنیا میں وہ خوار کیوں ہو رہے ہیں، اس کا جواب اسلامی تاریخ کے سنہرے

صفحات میں جو دہے، جب تک مسلمانوں نے اپنا سبق یاد رکھا، اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا، آسمانی نظام زندگی، نظام اخلاق کا اپنے قول وعمل سے نمونہ پیش کرتے رہے، دنیاان کے قدم چومتی رہے، پھر جب انہوں نے دنیا کا سبق بھلادیا، وہ دنیا کے قدموں میں گر گئے، اپنی حقیقت فراموش کردی، وہ قوموں میں بٹ گئے، انہوں نے طرح طرح بت بنالیے، زندگی کا مقصد کچھ کا کچھ ہوگیا تو حالات بھی بدل گئے۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر بھی جو ہوا اس کا حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے تذکرہ فرمایا ہے اور اس کو شکست کے بنیادی اسباب میں شمار کیا ہے: ''وہ عرب اس وقت قومی فخر وغرور میں گرفتار تھے اور بس قومی نعرے لگا رہے تھے'' (عالم عرب کا المیہ: ص ۳۲/)۔ اس وقت کی ہار نے مظلوم مسلمانوں کی کمر توڑ دی۔

پورے اسلامی تاریخ میں جب جب مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی، اس کے پیچھے اسباب کارفرما رہے ہیں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ صحیح اسلامی تعلیمات کے اندر ایسی جاذبیت اور ایسی کشمکش ہے کہ وہ دنیا کی ایک ضرورت ہے، اور جہاں دنیا کو اس کا احساس پیدا ہو رہا ہے وہاں حالات بدل رہے ہیں اور جب جب مسلمانوں نے اپنی ذمہ داریاں فراموش کی ہیں حالات نے ان کو سبق سکھایا، بقول حضرت مولاناؒ:

''پانچویں صدی ہجری میں بیت المقدس پر صلیبیوں کا تسلط اور اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں اسلام پر تاتاریوں کی یورش اور بغداد کی پامالی محض بے سر پیر کے واقعات نہیں تھے جن کو صرف تقدیر کی گردش اور قسمت کی خرابی یا اتفاق زمانہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا جائے، یہ دونوں واقعات دراصل اس طویل سلسلہ کا نتیجہ تھے، جس میں اخلاقی امراض، حد سے بڑھی ہوئی بے اعتدالی اور کج روی، مجرمانہ اعمال وحرکات مسلسل مغالطہ اور خود فریبیاں اور ایسے حالات کی موجودگی شامل ہے جس میں کسی زمانہ میں اور کسی جگہ بھی باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے، اور سب سے بڑھ کر زندگی کا وہ طرز جو خدا و رسول کو ناپسند ہے اور جو دین صحیح اور عقل سلیم کسی اعتبار سے بھی جائز نہیں'' (عالم عربی کا المیہ: ص ۱۲/)

مولانا نے عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے بھی اسباب گنائے ہیں، جن میں مولاناؒ کے نزدیک پہلا سبب مغربی تہذیب کا وہ سیلاب ہے جو ان ملکوں پر ایک طوفان کی طرح امنڈ کر آیا اور لذت پرستی، عیش پرستی، زندگی سے لطف اندوزی، نگاہ کی تفریح اور دل کی معصیت کی ایک طوفانی موج اور اخلاق، ضمیر، اصول وتعلیمات اور حلال وحرام کے امتیاز کی ساری متاع اپنے ساتھ بہالے گئی۔ دوسرا سبب قومیت عربیہ کا ظہور اور عروج ہے جس نے عربوں کی زندگی اور ان کے جذبات واحساسات پر بڑا گہرا اثر ڈالا، جس کے نتیجہ میں نعمت اسلام کی ناقدری اور نبوت محمدی (ﷺ) کی حق تلفی وناشکری کا عام رجحان سا پیدا ہوگیا۔

دنیا کے لیے اگر کشش ہے تو اسلام میں ہے مسلمانوں میں نہیں اور آج جہاں کشمکش ہے وہ مسلمانوں سے ہے، جس سوجھ بوجھ اور انصاف رکھنے والے کے سامنے اسلام کی تعلیمات آتی ہیں، اس کی اسلام سے کوئی دشمنی نہیں رہ جاتی۔

مسلمانوں کے غلط طرز زندگی کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، اور ایک بڑی تعداد حقیقت تک پہنچتی ہی نہیں اور قدیم مفروضہ پر ساری کارروائیاں کرتی رہتی ہیں، اس کے نتیجہ میں دنیا کو بھی بڑے نقصانات بھگتنے پڑ رہے ہیں۔

ذمہ داری مسلمانوں کی بھی ہے اور عالمی طاقتوں کی بھی، مسلمانوں کو صحیح نمونہ پیش کرنے کی ضرورت ہے اور دنیا کے لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے ورنہ یہ کشمکش جو مختلف ملکوں میں خونریزیوں کی شکل میں جاری ہے، اس کو بند نہیں کیا جاسکتا، اور اس کا نقصان صرف مسلمانوں کو ہی نہیں ہوگا پوری دنیا کو اس کے نقصانات بھگتنے پڑیں گے۔

فلسطین کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے دھڑکتا ہوئے دل کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں یک طرفہ کارروائیاں پوری دنیا کے مسلمانوں کے جذبات سے کھلواڑ کے مترادف ہیں، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اچھا نمونہ پیش کرنے کی ضرورت ہے، ہر ملک میں اور خاص طور پر جہاں وہ غیروں سے برسر پیکار ہیں۔

قارئین کرام! ۵/نومبر ۲۰۰۹ء کو عالمی رابطہ ادب اسلامی کی علاقائی شاخ (حلقہ رائے بریلی وملحقہ اضلاع) کے زیر اہتمام مسئلہ فلسطین سے متعلق ایک اہم سیمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کا مرکزی موضوع تھا ''مسئلہ فلسطین - تاریخی حقائق کی روشنی میں''، اس سیمینار میں پر مغز خطابات ہوئے اور معلوماتی مقالات پیش کئے گئے، یہ سیمینار مرکز الامام أبی الحسن الندوي کے ہال میں منعقد ہوا، افادۂ عام کی غرض سے تقریریں اور مقالات اس خاص شمارہ میں شامل ہیں۔ (ادارہ)

صدارتی خطاب

ایمان کامل کی ضرورت

مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہٗ

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، أما بعد!

محترم حضرات! آپ نے تین مقالے سنے، بڑے پر مغز مقالے تھے، ان کے ذریعے سے مسئلہ کو آپ پوری طرح سمجھ گئے ہوں گے، اور آپ کو اس مسئلہ کی تاریخ سے بھی واقفیت ہوگئی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وأنتم الأعلون إن کنتم مؤمنین﴾ (اور تم ہی سربلند ہوگے اگر ایمان والے ہو)۔ اللہ تعالیٰ جب یہ کہے کہ تم ہی سربلند ہوگے تو اس میں کسی چیز کی پھر کوئی گنجائش نہیں، اور ہمیں سربلندی اگر حاصل نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ شرط پوری نہیں ہو رہی ہے جس کی وجہ سے سربلندی حاصل ہوتی ہے ''إن کنتم مؤمنین'' یعنی اگر تم ایمان رکھتے ہو، تم ایمان والے ہو۔ تو یہ ایمان ہے جو مسلمان کو سربلند کرتا ہے، اور اس کو غلبہ عطا کرتا ہے۔

اس وقت فلسطین کی جو تاریخ آپ کے سامنے رکھی گئی اس کی بنیاد یہی ہے کہ جو لوگ فلسطین کو باقی رکھ سکتے تھے، اس کی حفاظت کر سکتے تھے انہوں نے ایمان کا ثبوت نہیں دیا، وہ بڑی طاقتوں سے ڈر گئے، اور انھیں ڈر لگا کہ ہم کرسیوں سے ہٹا دیے جائیں گے۔ یہی مسئلہ اس وقت پورے عالم میں چل رہا ہے کہ کرسیوں پر وہ مسلمان آگئے ہیں جو اس سے ڈرتے ہیں کہ ان کی کرسی نہ چلی جائے، چاہے کیسی ہی قربانی ان کو دینی پڑے، ایمان کی قربانی، دین کی قربانی، دینی قدروں کی قربانی، ہر طرح کی قربانی وہ دے سکتے ہیں لیکن کرسی نہ جائے، تو فلسطین میں بھی ان کی کرسی کی حفاظت وہ لوگ کر رہے تھے جن کے کہنے پر یہ لوگ چلتے ہیں، تو اسی سے مسئلہ پیدا ہوا۔ ۴۸ء میں یہ مسئلہ اٹھا اور تقریباً جب یہ حل ہونے والا تھا، بیت المقدس فتح ہونے والا تھا، صرف ایک رات کی کسر اور رہ گئی تھی کہ ایک رات اگر فوج اور رہ گئی ہوتی تو قدس فتح ہو جاتا، لیکن برطانیہ کا حکم آیا کہ مسلمان فوجیں واپس چلی جائیں اور بات چیت کے ذریعہ سے مسئلہ طے کیا جائے، فوج کے ذریعہ نہیں۔ کیا مطلب کہ فتح ہوتے ہوئے اس فتح کو چھوڑ دیا جائے، اور میز پر بیٹھ کر باتیں کی جائیں جس سے کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ زبردستی فوجوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا، جو رضا کار وہاں لڑنے کے لیے گئے تھے ان کو ہٹا دیا گیا، اور یہ فیصلہ ہوا کہ مسئلہ بات چیت سے حل کیا جائے۔ اور بات چیت ہے کہ آج تک ہو رہی ہے۔

اسرائیل کی حیثیت ایسی ہے جیسا کہ ابھی آپ کو بتایا گیا کہ وہ کسی سے لڑ نہیں سکتے، کوئی عرب حکومت بھی، کوئی مسلمان حکومت بھی اس کو آسانی سے شکست دے سکتی ہے، لیکن اس کو تقویت باہر کی طاقتوں سے حاصل ہے، باہر کی طاقتیں فوراً سامنے آجاتی ہیں، اور اس سے ہماری تمام حکومتیں ڈرتی ہیں، اس لیے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیتی ہیں، لیکن یہ چیز ہمیشہ نہیں رہے گی، کوئی قوم بھی ہو، خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے لیکن اس کو زوال ہوتا ہے، کوئی کتنا ہی مکاری کرے اس کا مکر ایک دن ناکام ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں لوگوں کو ایسا اختیار نہیں دیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی طاقت کو برقرار رکھیں اور جو چاہیں کریں، بس اللہ تعالیٰ موقع دیتا ہے، اور اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے کہ کیا وہ ایمان کا ثبوت دیتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا ثبوت دیتے ہیں یا اپنے نفس کے تابع رہتے ہیں، اور اپنی پسند کی فرماں برداری کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو دیکھنا چاہتا ہے، اور اس کو دیکھنے کے لیے پھر اللہ تعالیٰ ایک وقت دیتا ہے کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ کس نے اپنے نفس کی فرماں برداری کی ہے اور کس نے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی ہے، اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آتا ہے۔ تو یہ جو مقامات ہیں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور مسجد اقصیٰ ان تینوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی اچھی اچھی صفات بیان فرمائی گئی ہیں، جب آپ ﷺ کو معراج ہوئی ہے تو معراج کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اسراء میں فرمایا، ﴿إلیٰ المسجد الأقصیٰ الذي بارکنا حولہ﴾، حضور ﷺ کو معراج میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا جس کے اردگرد اللہ نے برکت رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ اس کے اردگرد ہم نے برکت رکھی ہے، جب اللہ تعالیٰ نے اس کے اردگرد برکت رکھی ہے تو وہ برکت کون چھین سکتا ہے، اس برکت کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ یہ دور جو چل رہا ہے یہ دور امتحان کا ہے، اس میں مسلمان اپنا امتحان دے رہے ہیں اور امتحان میں فیل ہو رہے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات طے ہو جائے گی کہ مسلمان ناکام ہو گئے اور فیل ہو گئے، اور وہ اپنی اس حیثیت کو ثابت نہ کر سکے جس حیثیت کا اللہ تعالیٰ نے ان سے مطالبہ کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی دوسرا انتظام کرے گا، اور وہ چیز اہل اسلام کو واپس ملے گی چاہے کسی ذریعہ سے ملے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے تو مشکل نہیں ہے، کسی چیز کو وہ ذریعہ بنا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وللہ جنود السمٰوات والأرض﴾ کہ اللہ تعالیٰ کی فوجیں تو آسمان و زمین میں سب موجود ہیں، کوئی اللہ تعالیٰ کو شکست نہیں دے سکتا۔ (بقیہ صفحہ ۸/ پر)

قوت ایمانی کی ضرورت

کلیدی خطاب

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی

نحمده و نصلی علیٰ رسوله الکریم. أما بعد!

رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر یہ سمینار منعقد کیا گیا ہے، اس طرح کے سمینار ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس سے پہلے اس موضوع پر منعقد ہوئے، کلکتہ میں ہوا، دہلی میں ہوا، کرناٹک میں، بنگلور میں ہوا، اس کا مقصد یہ ہے کہ اصل مسئلہ سے واقفیت پیدا کی جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت میڈیا پورا یہودیوں کے ہاتھ میں ہے، ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، ہم پورے ثبوت کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے بڑے جو معروف اخبارات ہیں، مجلّات ہیں، وہ پوری طرح سے یہودی میڈیا کے تابع ہیں، اور بعض دفعہ وہ اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں، اگر کوئی مضمون یا کوئی خط جو اس کے خلاف لکھا جاتا ہے تو وہ شائع کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، بعض وقت اس کی وجہ بھی بتا دیتے ہیں۔ اخباروں میں ایسی خبریں بھی آتی ہیں کہ گویا ہمارے اکثر اخبارات بظاہر امریکہ کے کنٹرول میں نہیں لیکن وہ امریکہ کے پیچھے ہیں، کیونکہ خود امریکہ کا پریس یہودیوں کے قبضہ میں ہے، اور امریکہ کی گردن یہودیوں کی گرفت میں ہے، انہوں نے میڈیا کے ذریعہ، اقتصادیات کے ذریعہ بڑی طاقتوں کو اپنا ماتحت بنالیا ہے، اس کی وجہ سے ہم صحیح صورت حال سے واقف نہیں ہو سکتے، ابھی غزہ کی جنگ میں فلسطینیوں ہی کو ظالم قرار دیا گیا حالانکہ نقصانات سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان کا جانی نقصان ایک ہزار سے اوپر ہوا اور یہودیوں کا نقصان جو بتایا جاتا ہے وہ صرف تیرہ (۱۳) ہے، اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے؟ پھر نقصانات جو ہوئے، مالی نقصانات، اور جائداد کا نقصان، اس کے متعلق خبریں بہت ہی احتیاط کے ساتھ دی جاتی ہیں، جبکہ بڑی تعداد میں ان کے مکانات تباہ ہو گئے، اس وقت بھی بعض لوگوں کے پاس اس شدید جاڑے میں رہنے کے مکانات نہیں ہیں، ابھی ہم نے عربی اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ بعض لوگوں نے کاغذ کا استعمال کیا ہے کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کرنے کے لیے، ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے، ٹھنڈک سے حفاظت کے لیے، تو یہ خبریں ہیں جو ہم تک پہنچتی ہی نہیں، اس لیے رابطہ ادب اسلامی نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سلسلہ میں سمینار کیے جائیں، انہوں نے موضوع رکھا تھا کہ "القدس عاصمة الثقافة العربية" اور اس میں یہ احتیاط رکھی کی کہ "اسلامیہ" کا لفظ اس میں استعمال نہیں کیا، اس لیے کہ اگر آج کل کوئی شخص اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہے تو فوراً اس پر قدامت پسندی، دہشت پسندی، دہشت گردی تک کا الزام لگ جاتا ہے اور وہ مظلوم ہو کر ظالم سمجھا جاتا ہے، چاہے وہ اپنے حق کے لیے کوشش کر رہا ہو، تو انہوں نے کہا یہ "قضیه عربیه" ہے۔

اس وقت خبریں آرہی ہیں کہ مسجد اقصیٰ کو خطرہ ہے، یہودی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ مسجد اقصیٰ کو مسمار کر کے ہیکل سلیمانی کو تعمیر کریں، اس کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کر رہے ہیں، کبھی وہ نیچے کھدائی کرتے ہیں تحقیقات کے نام پر، کبھی وہ مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے سے روکتے ہیں، ابھی خبریں آئی تھیں کہ ان کو نماز پڑھنے سے روک دیا اور اس میں یہودی زبردستی گھس گئے، اس سے پہلے آگ لگانے کی کوشش کی گئی، جس میں ہندوستان میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا، فسادات ہوئے تھے۔ تو یہ خبریں آتی نہیں، ان کی زیادتیوں کی خبریں ہم تک پہنچتی نہیں۔ تو ہم کو کم از کم مسجد اقصیٰ کے مسئلہ سے ہم کو واقف ہونا چاہیے۔

مسجد اقصیٰ کا مسئلہ اب صرف عربوں کا مسئلہ نہیں رہ گیا، یہ مسلمانوں کا مسئلہ ہے، فلسطین کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ عربوں کا مسئلہ ہے اور اس میں عربوں کی کوتاہی کو بہت دخل ہے، کیونکہ ایسے ہی اسرائیل کا قیام عمل میں نہیں آیا، جس طرح ہم ابھی تحقیقی مضامین سن رہے تھے، وہ سب صحیح ہیں، وہ تاریخی حقائق ہیں، لیکن مکر و دہاء، عیاری و مکاری نے یہودیوں کو کبھی بڑا فائدہ نہیں پہنچایا، نہ وہ کبھی غالب قوم بنے، ہمیشہ مارے مارے پھرے ہیں، دنیا بھر میں ان کو عزت اور سربلندی حاصل نہیں ہوئی، اگر مکر سے کبھی کسی کو فائدہ پہنچتا تو مکار آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا، ایسا نہیں ہے، قرآن مجید کہتا ہے: ﴿و قد مکروا مکرهم و عند الله مکرهم و إن کان مکرهم لتزول منه الجبال﴾ (اور انہوں نے اپنی چالیں چلیں اور ان کی سب چالیں اللہ کے یہاں ہیں اور وہ چالیں ایسی (غضب کی) تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جاتے)، تو مکر سے کچھ نہیں ہوتا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ بڑا مکار ہے لیکن گریٹ بریٹین (Great Britain) کا حال اب یہ ہے کہ اخبار و مجلّات میں یہ خبر آئی ہے کہ برطانیہ کا وجود خطرہ میں ہے، وہ تین حصوں میں کسی وقت بٹ سکتا ہے، اس لیے کہ اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور انگلینڈ میں ایسی کشمکش ہے، ایسی دشمنی ہے کہ وہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ اگر ایک علاقہ کا آدمی دوسرے علاقہ میں جاتا ہے تو وہ اس علاقہ کی طرف اپنی نسبت نہیں کرتا، اس لیے کہ پھر اس کے ساتھ مساوات کا معاملہ نہیں کیا جاتا، ایسی عصبیت ہے اس ملک کے اندر، اور اس کی مالی حالت ایسی ہے کہ اگر عربوں میں غیرت پیدا ہو جائے، اور وہ اپنا سرمایہ واپس لے لیں، تو برطانیہ کا

سقوط کسی وقت بھی ہوسکتا ہے، وہ مالی لحاظ سے بھی مستحکم نہیں ہے اور سیاسی اعتبار سے بھی اس کی حالت بہت ہی کمزور ہے اور سماجی لحاظ سے اس میں جو اخلاقی خرابیاں ہیں اس کو سب جانتے ہیں، اس لیے مکر سے قومیں زیادہ دن تک کامیاب نہیں رہ سکتی، کچھ دن تک دھوکہ تو دے سکتی ہیں۔

اسرائیل کے قیام کے بہت سے اسباب ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اس کو کچھ طاقتور ملکوں نے جو طاقت کی پوزیشن میں تھے گود میں بٹھا کر عربوں کے ہاتھ پیر باندھ کر ان کے کاندھے پر بٹھا دیا، اور اس کے بعد سے اب تک اس کی حفاظت کر رہے ہیں، اس طرح اسرائیل کا قیام ہوا، یہ تصور بہت غلط ہے کہ اسرائیل کو کوئی بہت بڑی برتری حاصل ہے، ہم مثالوں کے ذریعہ آپ کے سامنے یہ بات رکھ سکتے ہیں، اب تک جتنی بھی جنگیں ہوئیں ان کا آپ جائزہ لیجئے، اسرائیل کو کامیابی وہیں ہوئی جہاں اس کے مقابل نے کمزوری دکھائی۔ ہم کل ایک انگریزی کی کتاب دیکھ رہے تھے، جس میں بہت سے ملکوں کے بارے میں تفصیلات لکھی تھیں، اس کا لکھنے والا مسلمان نہیں ہے، کتاب انگریزی میں ہے اور اس کا لکھنے والا غالباً برطانیہ کا کوئی شخص ہے، اس نے یہ لکھا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام کس طرح ہوا؟ یہ خود اس نے لکھا، اس کا نسخہ ہمارے پاس موجود ہے، بہت پرانی کتاب ہے، اس میں اس نے لکھا ہے کہ یہودیوں کی طاقت بہت کم تھی، جب فلسطین برطانیہ کے قبضہ میں تھا، اسی وقت اس نے طے کر لیا تھا کہ اسرائیل کا قیام یہاں ہوگا تاکہ عربوں پر کنٹرول رہے، یہ برطانیہ کی پالیسی رہی ہے کہ جہاں سے اس کو جانا پڑا وہاں وہ کوئی فتنہ چھوڑ کر گیا تاکہ اس کو بار بار آکر حل کرنے کا موقع ملے۔ جیسے ایک قصہ ہم نے سنا کہ ایک شخص نے اپنا مکان بیچا اس نے یہ کہا جس نے مکان خریدا تھا اس سے کہ مکان تو پورا آپ کا ہے لیکن اس میں فلاں کمرے میں ایک کھونٹی ہے وہ کھونٹی ہماری ہے، اور آپ اس کی اجازت دیجیے کہ ہم اس کھونٹی کو استعمال کریں۔ انہوں نے سوچا کہ ایک کھونٹی کا معاملہ ہے اس میں کوئی حرج نہیں، اجازت دے دی۔ اب وہ ہر دوسرے تیسرے دن کہتا تھا کہ ہم اس کھونٹی کو دیکھنا چاہتے ہیں، ہم اس میں اپنا کوٹ ٹانگیں گے، اس طرح اس نے پریشان کیا کہ آخر میں وہ شخص مجبور ہوگیا کہ وہ مکان اس کو واپس کر دے، کیونکہ کہ صبح شام وہ کسی وقت بھی کہہ سکتا تھا کہ ہم اپنی کھونٹی کو دیکھنا چاہتے ہیں، ہم وہاں اپنا کوٹ ٹانگیں گے، ہم نے جو کوٹ ٹانگا ہے اس کو نکالنا چاہتے ہیں، تو اسی طرح برطانیہ نے یہ کیا کہ جس ملک میں وہ رہا اپنی کھونٹی چھوڑ کر گیا، اور اس کھونٹی کے ذریعہ اس کو موقع ملتا ہے دخل دینے کا، اور ان قوموں میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اس مکان کو پوری طرح سے آزاد کرا سکیں یا کھونٹی نکال کر اس کے سر پر ماردیں اور اس کے بعد کہیں کہ جاؤ، کھونٹی لے جاؤ، اس کے سر میں ٹھوک دیں، جب یہ جرأت پیدا ہو جائے گی ان مسلمان ملکوں میں یا ان عرب ملکوں میں جو اسرائیل کو جھیل رہے ہیں تو اس وقت اسرائیل کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔

جنگوں کے بارے میں ہم آپ کو بتاتے ہیں، ۱۹۴۸ء کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ اسرائیل کی کوئی طاقت نہیں تھی، جو جنگ تھی چار، پانچ ملکوں نے اس کا مقابلہ کیا، یہ مقابلہ ظاہری تھا، عرب کی فوجوں کو حکم تھا کہ وہ نہ لڑیں، اور بعد میں جب کچھ مجاہدین آگے بڑھ گئے اور اسرائیل کے لیے خطرہ بن گئے تو ان ملکوں کے فوجیوں نے مسلمان ملکوں کی فوج کے افسر کو حکم دیا گیا کہ تم واپس ہو ورنہ ہم تم کو Shoot کر دیں گے، یہ حقیقت ہے، ہم پرانی تاریخ ضرور پڑھتے ہیں، اس سے بہت سی معلومات ہم کو حاصل ہوتی ہیں لیکن اس وقت کی جو تاریخ ہے اس کو بھی جاننا چاہیے، تو ۱۹۴۷ء میں یہ ہوا کہ ان سب ملک نے دھوکہ دیا، ان کی فوجوں نے دھوکہ دیا، اس لیے کہ اس وقت تک اکثر فوجیوں کے جو ذمہ دار تھے، جو جنرل تھے وہ یا تو برطانیہ کے تھے یا فرانس کے تھے یا یورپ کے مشیر تھے، ان کو لڑنے سے مجبور کر دیا گیا، کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ عرب زیادہ تھے تعداد میں لیکن وہ شکست کھا گئے Because they were not united یہ لفظ اس نے لکھے ہیں، ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک غیر مسلم کیسے لکھتا ہے Because they were not united (وہ متحد نہیں تھے)، وہ خائن تھے اور اسی بنیاد پر سارے انقلاب ہوئے، مصر کا انقلاب ۱۹۵۲ء میں ہوا، اس کی پہلی جو بنیاد تھی وہ یہی کہ ہمارے ساتھ خیانت کی گئی، اسلحہ فاترہ کے وجہ سے ہم کو شکست ہوئی، ہم کو خراب اسلحہ دیے گئے، ہم کو لڑنے سے روکا گیا، ۱۹۵۲ء کا جو انقلاب ہوا تھا اس کی بنیاد یہی تھی، ۱۹۴۸ء کی جنگ، اور ۱۹۵۶ء کی لڑائی جب ہوئی، نہر سوئس کو جمال عبدالناصر نے جب قومیہ تو تین ملکوں نے مصر پر حملہ کر دیا، اس میں اسرائیل تھا، فرانس تھا، برطانیہ تھا، تین ملکوں نے حملہ کیا اور مصر خطرہ میں پڑ گیا، حالانکہ انہوں نے اپنی طاقت بھر مقابلہ کیا، جمال عبدالناصر اسی وجہ سے ہیرو (Hero) بنے، پھر روس نے مداخلت کی، امریکہ نے ساتھ دیا، امریکہ نے بھی کہا کہ تم لوگ اپنی فوجیں واپس لے جاؤ، روس نے الٹی میٹم (Ultimatum) دیا تو ان کو فوجیں واپس لے جانی پڑیں، اس جنگ میں اسرائیل مصر کے اندر تک پہنچ گیا تھا ان ملکوں کی مدد سے، اور پھر اس نے وہاں بڑا قتل عام کیا، اس لیے کہ یہ جو بڑے ملک تھے جو اس وقت بڑی طاقت تھے وہ اسرائیل کے ساتھ تھے، یہ ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔

اسی طرح ۱۹۶۷ء کا واقعہ کھلا ہوا ہے، حضرت مولانا کا رسالہ ہے، "فاستخفّ قومہ فأطاعوہ" وہ رسالہ آپ پڑھیے، عربی پڑھنے والے پڑھیں، کس طرح اس میں مذاق کیا گیا عرب فوجوں کے ساتھ، مصری فوجوں کے ساتھ، وہ جزیرہ نمائے سینا کو پار کر رہی تھی اور اسرائیل کے ہوائی جہاز آئے اور ان کے ہوائی اڈوں کو تباہ کر دیا، انہوں نے اتنی بھی فکر نہیں کی تھی کہ اپنی ہوائی فوجوں کو تیار رکھتے، اپنے ہوائی اڈوں کی حفاظت کر سکتے، اس پر حضرت مولاناؒ کا ایک رسالہ ہے اور وہی جمال عبدالناصر کے زوال کا سبب بنا لیکن یہی مصری فوج ۱۹۷۳ء میں بارڈر لائن کو پار کر کے اسرائیل کے اندر داخل ہوگئی اور اسرائیلی وزیر اعظم امریکہ میں جا کر رویا، یہ تاریخ کا واقعہ ہے، اگر آپ اس تاریخ کے واقعہ کو پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت جو وزیر اعظم تھا اس نے جا کر امریکہ سے فریاد کی کہ ہم کو بچایے، ہم گئے، اسرائیل کے اندر مصری فوجیں داخل ہوگئیں ہیں، اس وقت اسرائیل خطرہ میں پڑ گیا تھا، چنانچہ امریکہ نے براہ راست

مداخلت جہاں مصری فوج تھی وہاں امریکہ نے اپنی فوج اتار دی، اسرائیل کی حفاظت اس طرح ہوئی اور وہی مصری فوج جو ۱۹۶۷ء میں شکست سے دو چار ہوئی تھی اسی طرح مصری فوج نے ۱۰ر رمضان میں اس نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور نہر سوئس پار کی اور جو وہ انہوں حفاظتی انتظام کیا تھا، اسرائیل جسے ناقابل تسخیر کہتا تھا، جو سد بنایا تھا انہوں نے حفاظت کے لیے، وہ کہتا تھا کہ اس دفاعی لائن کو کوئی پار نہیں کرسکتا، مصری فوج نے اس کو پار کیا اور ان کے ملک کے اندر داخل ہوگئی، تو جب ان کو موقع ملا انہوں نے کیا اور جب ان میں ارادہ پیدا ہوگیا، ایمانی جذبہ پیدا ہوگیا، تو اسی فوج نے جو اس سے پہلے شکست کھا چکی تھی، کامیابی سے ہم کنار ہوئی، اس کے بعد آپ دیکھئے جو جنگ ہوئی جو حزب اللہ سے لبنان میں جنگ ہوئی، اس کے بعد ابھی غزہ میں جو جنگ ہوئی، اسرائیل نے کہا تھا کہ ہم فیصلہ کن جنگ لڑ رہے ہیں، ہم جب تک فتح نہ کرلیں گے تب تک چھوڑیں گے نہیں لیکن اسرائیل کو پیچھے ہٹنا پڑا، اور وہ علاقہ محفوظ ہے اور اب بھی محفوظ ہے، اسرائیل نے اس کا محاصرہ کر رکھا ہے، پانی بند کر رکھا ہے، ساری پابندیوں کے باوجود، ساری دشواریوں کے باوجود فلسطینی قوم جس میں وہ ایمانی جذبہ ہے اس ایمانی جذبہ سے وہ مقابلہ کر رہی ہے، اس لیے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسرائیل اپنے مکر کی وجہ سے یا فوجی طاقت کی وجہ سے ناقابل تسخیر ہے، قوت ایمانی، اور جذبہ، قوت ارادی جب بھی پیدا ہوگی إن شاء اللہ اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا چاہے جتنے ہی ملک اس کی حفاظت کریں، اس لیے کہ سارے ملک اس کی حفاظت نہیں کرسکتے، وہ چار پانچ ملک بھی جن کے وہ گھیرے میں ہے، جب مصر یہ کرسکتا ہے تو یہ چار پانچ ملک کی فوجیں بہت کچھ کرسکتی ہیں، اللہ کی مدد سے اور اس طرح کی مثالیں بہت ہیں، اسرائیل کیا بھی ایک لیڈر نے یہ بیان دیا ہے کہ ہم ایٹم بم سے یا فوج سے نہیں ڈرتے ہیں، ہم اس سے ڈرتے ہیں کہ ان میں قوت ایمانی پیدا ہو جائے۔ یہ الفاظ صاف صاف ہیں کہ ہم قوت ایمانی سے ڈرتے ہیں، یہ جو اخوانی ہیں اور جو مجاہدین ہیں جب ان کو موقع ملے گا تو ہمارے لیے خطرہ ہے، ہمارے لیے خطرہ ایٹم بم یا فوجی طاقت نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ قوت ایمانی، قوت ارادی جب پیدا ہوگی تو إن شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اس وقت جو سمینار کیا جارہا ہے یا اور شہروں میں جو سمینار ہوئے ان کے ذریعہ واقفیت پیدا کرنے کے لیے کوشش کی جارہی ہے اور واقفیت کے بعد ہی کہتے ہیں کہ پہلے شعور پیدا ہوتا ہے پھر قوت عمل اور قوت ارادی پیدا ہوتی ہے، بس یہی مقصد تھا ہمارے سمینار کا، جو مقالات پڑھے گئے ان سے ہمیں بڑی واقفیت حاصل ہوئی خود ہم کو معلومات حاصل ہوئیں، ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ ان نوجوانوں نے محنت کی اور اپنا مواد تیار کیا اور بہت مفید یہ سمینار ہوا، انہی چند کلمات پر ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العلمین

بقیہ : ایمان کامل کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو ''مبارک'' بنایا ہے، اور اس کے اردگرد برکت رکھی ہے، تو اس کو کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچا سکتا جو دائمی نقصان ہو، لیکن یہ مدت امتحان کی ہے، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمان اس امتحان میں ناکام ہو رہے ہیں، لیکن ہم کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور اپنے ایمان کو ٹٹولنا چاہیے، اور یہ سمجھنا چاہیے کہ وہاں اگر ایمان کی کمی اور کوتاہی سے نقصان ہو رہا ہے تو ہم جہاں بھی رہیں گے وہاں اگر ہمارے ایمان میں کمی اور کوتاہی ہوگی تو ہم نقصان اٹھائیں گے اور مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ یہ صرف فلسطین کے مسلمانوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے، مسلمان دنیا میں جہاں بھی ہیں اگر وہ وہی صورت اختیار کریں گے جو فلسطین میں اختیار کی گئی ہے تو ان کو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ مسئلہ صرف فلسطین کا نہیں ہے، مسلمانوں کے سوچنے کا ہے کہ وہ اپنی حفاظت کیسے کرسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے بغیر وہ اپنی حفاظت نہیں کرسکتے، لہٰذا وہ طریقے اختیار کرنے پڑیں گے جن میں اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اور ایمان ہے، اور اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو اسی طرح کے واقعات دوسری جگہ بھی پیش آسکتے ہیں۔

ہم کو اسلامی بھائی چارے کے لحاظ سے مسلمانوں کو جہاں بھی مصیبت پیش آئے، جہاں بھی مسائل پیش آئیں ان کی ہمدردی کرنی چاہیے، اس لیے کہ حکم ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اور یہ کہ مسلمان مسلمان کا ایسا بھائی ہے جیسے ایک جسم ہو کہ اگر ہاتھ میں تکلیف ہوتی ہے تو پیر بھی محسوس کرتا ہے کہ تکلیف ہو رہی ہے، جسم میں کسی جگہ بھی تکلیف ہوگی تو جسم کا دوسرا حصہ یہ تکلیف محسوس کرتا ہے، اس لیے مسلمانوں پر جہاں بھی پریشانی یا مصیبت آئے تو دوسری جگہ کے مسلمانوں کو بھی اس تکلیف کو اور پریشانی کو محسوس کرنا چاہیے، اس لحاظ سے فلسطین کا مسئلہ صرف فلسطین ہی کا نہیں ہے، ہمارا مسئلہ ہے، فلسطین میں ہمارے سب بھائی ہیں، ان کو اگر مصیبت پیش آرہی ہے تو گویا کہ ہم کو وہ مصیبت پیش آرہی ہے، کم سے کم ہمیں اس کا احساس کرنا چاہیے، اور جو ہمارے بس میں ہے وہ کرنا چاہیے، کم سے کم دعا ہمارے بس میں ہے تو ہم دعا کے ذریعے سے ان کی مدد کرسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے دعا کی صلاحیت ہم سب کو دی ہے، ہر شخص دعا کرسکتا ہے، تو ہم اگر کچھ نہیں کرسکتے تو دعا کے ذریعہ سے ہم ان کی مدد کریں۔ اور ان کے حالات معلوم کر کے ان کو صحیح طور پر ہم سمجھ سکیں اور اس کا احساس کرسکیں، کم سے کم ہمیں یہ کرنا چاہیے، اور اسی مقصد سے یہ سیمینار اور جلسہ رکھا گیا کہ آپ کے سامنے یہ مسئلہ واضح ہو، اور آپ اس کا درد محسوس کریں، اس لیے کہ مسئلہ آپ کے اسلامی بھائیوں کا ہے تو آپ کا بھی ہے، آپ درد محسوس کریں اور درد محسوس کر کے (آپ کے بس میں جو ہے) کم سے کم دعا کریں، اور اپنے لیے بھی سوچیں کہ ہم میں کیا کوتاہیاں ہیں اور ان کوتاہیوں سے ہمیں کیا نقصان پہنچ سکتا ہے، اپنی بھی فکر کریں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین.

مسائل کے حل کے لیے
سیاسی اور فوجی طاقت ضروری ہے

مفتی راشد حسین ندوی

آج دنیا اپنے مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے، دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ دور حاضر میں مہذب اقوام میں قانون کی حکمرانی قائم ہے، اور یہ جدید تہذیب خاص طور سے مغربی طرز فکر کی دین ہے، ورنہ پہلے جنگل کی حکمرانی تھی اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کا قانون رائج تھا، مغربی اقوام اور امریکہ کے داخلی معاملات اور اندرونی صورتحال کا جائزہ لینے سے ایک حد تک یہ دعویٰ صحیح بھی معلوم ہوتا ہے، بڑی حد تک اندرون ملک رہنے والے باشندوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں، رنگ، نسل، مذہب، جنس اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی بنیاد پر واقعتاً قانون امتیاز کی اجازت نہیں دیتا، اگرچہ حالات کا گہرائی سے تجزیہ کرنے والے اور خبروں پر نظر رکھنے والوں سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ان قانونی بندشوں کے باوجود ماورائے قانون ایشائی جنس کے باشندوں سے امتیازی سلوک عام ہے، پھر اگر ان باشندوں کا اسلام سے تعلق ہو خاص طور سے اگر وہ مذہبی جذبات رکھتے ہوں تو اندرونی کینہ ہزار کوششوں کے باوجود ظاہر ہو ہی جاتا ہے، اور بیچاروں کے لیے اس پر قابو پانا مشکل ثابت ہوتا ہے۔

یہ تو داخلی معاملات میں ہے، جس کے بارے میں بڑی حد تک ان کے دعوی کی صحت کا اعتراف کیا جاسکتا ہے، لیکن بات جب اندرونی معاملات اور داخلی حالات کے بجائے خارجی سیاست اور اقوام عالم سے تعلقات کی ہو تو ان کا یہ دعوی بالکل غلط اور کھوکھلا ثابت ہوتا ہے، اگرچہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں، اور عالمی سیاست میں بھی اپنے کو انصاف پرور مہذب اور قانون کا احترام کرنے والا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خارجی سیاست میں ان کا مکھوٹا بالکل ہی اتر جاتا ہے، اور دلکش چہرے کے نیچے چھپا ہوا ڈراونا، مہیب اور کریہہ چہرہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ہم صرف اشارتاً چند پر اکتفاء کرتے ہیں:

۱- مغربی اقوام یہ دعوی کرتی ہیں کہ وہ جمہوریت کی حامی ہیں، اور اس کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں، مغربی ممالک میں جمہوری نظام قائم بھی ہے، لیکن اگر اسلامی ممالک میں سے کسی میں بھی کسی دینی فکر کی حامل جماعت کو کامیابی مل جائے تو کسی طور پر بھی وہ اس کو اقتدار پر دیکھنا پسند نہیں کرتے، بلکہ اگر ان کو ظلماً بھی بے دخل کیا جائے، تو خاموشی اختیار کرتے ہیں، بلکہ واقعات پر نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے تو یہ ہے کہ پس پردہ ان کو بے دخل کرنے والوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں اور شاباشی دیتے ہیں، اس کی ایک مثال الجزائر ہے، جہاں دینی جماعتوں نے کامیابی پائی، فوجی آمروں نے ان کو اقتدار منتقل نہیں کیا بلکہ الٹے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے لیکن مغربی طاقتوں نے مجرمانہ خاموشی اختیار کرلی، یہی حال ترکی میں نجم الدین اربکان کی پارٹی کے ساتھ بھی ہوا، اور یہی حشر حماس کے منتخب نمائندوں اور ان کے وزیر اعظم کے ساتھ بھی کرنے کی کوشش ابھی کچھ ہی سال پہلے ہوئی۔

۲- امریکہ پر حملہ ہوا، اس نے الزام لگایا کہ حملہ القاعدہ کے لیڈر اسامہ بن لادن کے منصوبہ سے ہوا، لہٰذا افغانستان سے امریکہ نے مطالبہ کیا کہ اسامہ کو ہمارے حوالہ کیا جائے، ورنہ حملہ کیا جائے گا، اسامہ نے اس الزام سے انکار کیا، افغانستان نے امریکہ سے کہا کہ اس بات کے ثبوت پیش کیے جائیں کہ حملہ میں اسامہ کا ہاتھ ہے، لیکن امریکہ نے اس کی ایک نہیں سنی، عالمی قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اس نے طالبان کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اس کا شکار نہ معلوم کتنے معصوم بچے، عورتیں اور مرد بنے، یہ سلسلہ آج بھی بند نہیں ہوا ہے، کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ افغان حکومت کو ثبوت دئے جاتے؟ اور خون خرابہ کے بغیر ہدف حاصل کرلیا جاتا؟ کیا اب تک امریکہ اسامہ کو حاصل کرسکا؟ آج امریکہ میں تقریباً ساری دنیا سے تعلق رکھنے والے مجرم پناہ لیے ہوئے ہیں، یہ حکومتیں کیا امریکہ سے اسی لب ولہجہ میں ان کی واپسی کا مطالبہ کرسکتی ہیں؟

۳- عراق پر الزام لگایا گیا کہ اس کے پاس مہلک ہتھیار ہیں، عراق نے انکار کیا، عراق میں اقوام متحدہ کے اہلکاروں نے تلاشی لی، حد یہ ہے کہ صدارتی محل کی بھی تلاشی لی گئی، اور کلین چٹ دی گئی کہ اس کے پاس مہلک ہتھیار نہیں ہیں، لیکن امریکہ نے کہا کہ اس کے پاس ناقابل تردید شواہد موجود ہیں کہ عراق نے یہ ہتھیار چھپا رکھے ہیں، پھر عالمی قانون ایک طرف، دنیا کی دھائیاں ایک طرف امریکہ اور برطانیہ نے مل کر عراق کا تیا پانچہ کردیا، اس کے صدر کو پھانسی پر لٹکا دیا، پورا عراق کھنگال ڈالا گیا، آج تک وہ ہتھیار نہ مل سکے، اس کے باوجود کیا آج کوئی امریکہ اور برطانیہ کا گریباں پکڑ کے کہہ سکتا ہے کہ جس بنیاد پر حملہ کیا گیا وہ غلط بیانی پر مبنی تھا، لہٰذا جنگ کا پورا خرچ دو، تمام مقتولین کا خوں بہا دو، اس حملہ میں جتنے افسران، صدر امریکہ اور وزیر اعظم برطانیہ سمیت ملوث تھے ان پر ایک بے گناہ ملک پر حملہ کرنے اور لاکھوں بے گناہوں کا قتل عام کرانے کا مقدمہ چلاؤ۔

ان تفصیلات کا مقصد درحقیقت یہ واضح کرنا ہے کہ مغربی اقوام قانون کی جس بالادستی کا ذکر کرتے نہیں تھکتیں، عالمی اور خارجی سیاست میں دراصل اس

کا کوئی وجود نہیں ہے، حالات اور واقعات صاف طور سے بتاتے ہیں کہ در اصل قدیم مثل ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' آج بھی دنیا کے قوانین میں بنیادی حیثیت کی حامل ہے، اس کے ہوتے ہوئے عالمی قوانین کی دھائی دینا، اقوام متحدہ کی اقرار داد (Resolution) کا حوالہ دینا اور اس سے دور تک کی پلاننگ اور منصوبے بنانا شیخ چلّی کے منصوبہ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے، کامیابی تبھی مل سکتی ہے جب ایمان کامل کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر عمل بھی مکمل طور سے ہو، اللہ تعالیٰ نے جہاں ایک طرف یہ فرمایا ﴿و أنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين﴾ (اگر تم ایمان والے ہو تو تمہیں سربلند ہوگے)، نیز فرمایا ﴿إن تنصروا الله ينصركم و يثبت أقدامكم﴾ (اگر تم اللہ کا حکم مانو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا)، وہیں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تمہارا طاقتور ہونا ضروری ہے، ارشاد فرمایا: ﴿و أعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدوكم﴾ (جتنا ممکن ہو دشمنوں کے لیے طاقت حاصل کرو اور گھوڑے حاصل کرو تا کہ اس سے تمہارے دشمنوں پر تمہاری دھاک پڑ جائے)۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو بالکل نظر انداز کیا گیا، مسلم حکومتوں نے اس کے سلسلہ میں مجرمانہ غفلت برتی، غور کیا جائے کہ فلسطین میں اسلام سے پہلے ہی سے ایک قوم آباد تھی پھر اس نے اسلام کی آمد کے بعد اسلام قبول کیا، اس سرزمین پر ۱۸۸۰ عیسوی سے پہلے یہودیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، پھر مذکورہ سنہ سے منصوبہ بنتا ہے، آہستہ آہستہ زمینوں کی خرید ہوتی ہے، پھر علاقہ برطانوی انتداب میں آتا ہے، یہودیوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا جاتا ہے، ان سے فلسطین میں ان کی حکومت بنانے کا وعدہ کیا جاتا ہے، عربوں کو وہاں سے بے دخل کیا جاتا ہے اور ساری دنیا سے یہودیوں کو لایا جاتا ہے، پھر اپنی نگرانی میں برطانیہ اسرائیل کی حکومت قائم کرواتا ہے، امریکہ بھی اس کی سرپرستی کرتا ہے، یہ تو عالمی طاقتوں کی طرف سے اسرائیل کی خارجی مدد تھی، لیکن خود اسرائیل دن رات ایک کر دیتا ہے، مقبوضہ علاقوں کو قابل کاشت بنانے کی انتھک کوشش کرتا ہے، یہودی طلبہ سخت ترین اور مشکل ترین مضامین اختیار کرتے ہیں، پوری قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، ہر میدان کے ماہرین کی ایک ٹیم تیار کر دی جاتی ہے، نامعلوم کتنے یہودی سائنسدانوں نے مختلف ایجادات اور تحقیقات کے بدولت نوبل پرائز حاصل کیا، اور آج اسرائیل اتنا چھوٹا ملک ہونے کے باوجود چین اور ہندوستان جیسے ممالک کو کئی میدانوں میں تربیت کی پیشکش کرتا رہتا ہے، اور کئی ممالک کو اپنے بنائے ہوئے ہتھیار سپلائی کرتا رہتا ہے، اس نے ایٹم بم بنا رکھا ہے اور کئی دوسرے مہلک ترین ہتھیار بھی خود سے تیار کرنے لگا ہے، شروع دور سے وہاں جمہوریت قائم ہے، اور جنگ کے حالات میں بھی الیکشن کا عمل متاثر نہیں ہوتا۔

دوسری طرف علاقہ میں چاروں طرف عرب ممالک واقع ہیں جو صدیوں سے آباد ہیں، عام طور سے خوشحال ہیں، لیکن جہاں شخصی اور شاہی نظام ہے وہاں کی تو خیر بات ہی کیا، جہاں نام نہاد جمہوریت ہے وہاں بھی شخصی حکومت سے بھی بدتر نظام ہے، جو شخص حکمراں بن جاتا ہے وہ موت تک حکمراں رہتا ہے، اِلّا یہ کہ انقلاب آجائے، نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تگ و دو تا حیات کرسی بچانے میں لگی رہتی ہے، اور پوری عمر مغربی آقاؤں کی چاپلوسی میں گزر جاتی ہے، ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ آقا کی مرضی کے خلاف بولے تو کرسی نکل جائے گی، یہی وجہ ہے کہ ان کو عوام کی فلاح سے عموماً کوئی واسطہ نہیں ہے، سوائے کچھ رسمی اور دکھاوٹی چیزوں کے مغربی تہذیب میں سے ان کو صرف بے حیائی اور عریانی پسند آتی ہے، تا کہ نوجوان اس کے نشہ میں مدہوش رہیں، اور اسلامی غیرت وحمیت بیدار نہ ہونے پائے، بقیہ مغربی تہذیب کے قابل تقلید پہلوؤں سے وہ ہمیشہ پہلو تہی اختیار کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اگر ملک میں حقیقی جمہوریت لے آئے یا تعلیم عام کر دی اور ملک میں دانشور، سائنسداں اور مختلف میدانوں کے ماہرین تیار ہو گئے تو مسند اقتدار متزلزل ہو سکتی ہے، عوام کا شعور بیدار ہو گیا تو ملی حمیت کا ایسا طوفان اٹھ سکتا ہے جو ان کے اقتدار کو تنکے کی طرح بہا دے گا، نتیجہ یہ ہے کہ وہ ماہرین امریکہ، یورپ، چین اور ہندوستان سے بلاتے ہیں، بھلا وہ ایسا کام کیوں کرنے لگے کہ وہ خود فیل ہو جائیں اور ان کی ملازمت جاتی رہے، ہتھیار امریکہ اور یورپ سے منگواتے ہیں، غور کیا جائے کہ کیا خود اسرائیل کے مربی اور اس کے سرپرست ایسے ہتھیار دیں گے جو اسرائیل کے خلاف کارگر ہو سکے، اسرائیل جب بھی ظلم و درندگی کے مناظر دکھاتا ہے تو فوراً دہائی دینے کے لیے یورپ و امریکہ کے آقا کے پاس جاتے ہیں جس طرح کمزور بچہ پر طاقتور بچہ ظلم کرے تو وہ طاقتور بچہ کی شکایت اس کے باپ کے پاس لے جاتا ہے، باپ دکھاوے کو ڈانٹ پلاتا ہے اور تنہائی میں باپ بیٹے کمزور بچہ کی بے بسی پر قہقہہ لگاتے ہیں ؎

میر یہ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

انہیں وجوہات سے اگر چہ ہم اسلامی ممالک فلسطین وغیرہ میں کی جانے والی جد و جہد کی دل سے قدر کرتے ہیں، مجاہدین کی عظمت کو سلام پیش کرتے ہیں، دل سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی سے ہمکنار کرے، اور قبلہ اول کو یہود کے پنجہ استبداد سے آزاد کرانے کی سبیل پیدا کرے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ عالمی تناظر میں مسلمانوں کی جو پوزیشن ہے اس میں ایک جگہ کا مسئلہ حل بھی ہو جائے تو عالمی بساط کے شاطر دس نئے مسائل پیدا کر دیں گے، مسلمانوں کے مسائل کا پائدار حل تبھی سامنے آسکتا ہے جب ایمان و یقین کی دولت سے لیس ہو کر حکم الٰہی ''واعدوا لهم'' پر عمل پیرا ہونے کے لیے تعلیم و سائنس میں منصب امامت سنبھال لیں، اور ہر میدان میں خود کفیل بن کر یورپ و امریکہ کی غلامی کا داغ مٹائیں، دنیا کو ان کی ضرورت ہو ان کو دنیا کی ضرورت نہ ہو تو تمام عالم کی نگاہیں بدل جائیں گی لیکن ظاہر بات ہے کہ موجودہ حالات میں یہ صرف ایک خوبصورت خواب ہی کہا جاسکتا ہے۔

ارض مقدس

قرآن کریم کی روشنی میں اور موجودہ توریت کے حوالہ سے

عبدالسبحان ناخداندوی

قدرت کی نگاہ انتخاب جس طرح افراد پر پڑتی ہے اسی طرح زمینوں پر بھی پڑتی ہے، جس طرح اللہ کے منتخب بندے دنیا میں سب سے اونچا مقام پاتے ہیں، اسی طرح زمینوں کے وہ ٹکڑے بھی رشک ارض وسماء بنتے ہیں جن کو تجلیات الٰہیہ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، حرمین شریفین کے بعد جس سرزمین کو سب سے زیادہ بابرکت اور سب سے بڑھ کر مقدس ہونے کا شرف حاصل ہے وہ بلاشبہ فلسطین کی سرزمین ہے، اسی کے شہر المقدس میں مسلمانوں کا قبلہ اولیٰ یعنی مسجد اقصیٰ واقع ہے، اللہ نے اس پورے خطہ کو جمال ظاہری و باطنی سے آراستہ رکھا ہے، یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا مسکن ہے، جہاں سے اللہ کے جلیل القدر انبیاء نے اللہ کے بندوں کو ہدایت کا پیغام دیا، توحید کی شمع فروزاں کی اور دنیا کے اندھیروں میں خدا پرستی کے اجالے بکھیرے۔

اس سرزمین کی قسمت اس وقت جاگ اٹھی جب اللہ کے خلیل ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اسے **دار الھجرت** قرار دیا گیا اور سارے جہانوں کے لیے اس پوری زمین کو سراپا خیر و برکت بنایا گیا، ارشاد باری ہے، "**و نجیناہ و لوطاً إلیٰ الأرض التي بارکنا فیها للعالمین**" (ہم نے ابراہیم ولوط کو نجات دے کر اس زمین میں پہنچایا جس میں ہم نے سارے جہانوں کے لیے برکت رکھی ہے)۔

نیل وفرات کے درمیان واقع یہ جنت نظیر خطہ ہمیشہ کے لیے **الأرض المقدسة** کہلایا، یہیں اسماعیل واسحاق پیدا ہوئے، یہیں یعقوب علیہ السلام اور آل یعقوب پروان چڑھے، اسی چمن میں یحییٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام نے آنکھ کھولی، یہیں داؤد علیہ السلام وسلیمان علیہ السلام کی سلطنتیں قائم ہوئیں، یہاں کی فضائیں انفاس رسالت سے مہکتی ہیں، یہاں کے ذرات انوار نبوت سے دمکتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے مبارک قدم جہاں پڑے وہ پورا خطہ انوار الٰہی سے جگمگا اٹھا، چاہے حجاز ہو یا شام ہو، یا پھر مصر ہو۔

اسی زمین کے ایک حصہ پر یہود زبردستی قابض ہیں اور نیل سے لے کر فرات تک کی پوری زمین کو اپنے لیے میراث کی زمین قرار دیتے ہیں۔

آیئے کتاب اللہ کی روشنی میں اور موجودہ توریت کے حوالہ سے ان کے دعوے کا جائزہ لیتے ہیں، پہلے ہم موجودہ توریت کے حوالہ سے بات کریں گے پھر قرآن سے دلائل فراہم کریں گے۔

یہود ارض مقدس کو دو بنیادوں پر اپنی میراث کی سرزمین کہتے ہیں، ایک حضرت ابراہیمؑ سے موروثی تعلق کی بناء پر دوسرے حضرت موسیٰ کی بشارتوں کی وجہ سے جو توریت میں جابجا مذکور ہیں۔

جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام سے موروثی تعلق کا معاملہ ہے تو موجودہ یہودیوں کا دامن ان شہادتوں سے خالی ہے جن کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو یقینی طور پر آل ابراہیم علیہ السلام یا آل یعقوب علیہ السلام ثابت کریں، بفرض محال اسے تسلیم بھی کیا جائے تو موجودہ توریت یہ بتاتی ہے کہ یہ وعدہ غیر مشروط نہ تھا بلکہ بعض شرائط کو پورا کرنے کی صورت میں تھا۔

جہاں تک موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ملنے والی بشارتوں کا معاملہ ہے تو بلاشبہ موجودہ توریت میں متعدد جگہوں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارض مقدسہ کو میراث کی زمین قرار دئے جانے کا ذکر ہے، ایک جگہ رقم ہے: "دیکھو میں نے یہ ملک تمہیں دے دیا ہے، لہٰذا اس میں داخل ہو جاؤ اور اس ملک پر اپنا تسلط جمالو جسے تمہارے باپ دادا ابراہیم علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام کو اور ان کے بعد ان کی نسل کو دینے کی خداوند نے قسم کھائی ہے" (استثناء-۱:۸)

دوسری جگہ یوں مرقوم ہے: "تاکہ تم خداوند اپنے خدا سے محبت رکھو، اس کی آواز سنو اور اس سے لپٹے رہو کیونکہ خداوند تمہاری زندگی ہے اور وہ اس ملک میں جسے اس نے تمہارے باپ دادا ابراہام علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کو دینے کی قسم کھائی تھی تمہیں لمبی عمر عطا کرے گا"۔ (استثناء-۳۰:۲۰)

لیکن خود توریت کی رو سے یہ وعدہ غیر مشروط نہ تھا، بلکہ اطاعت و فرمانبرداری کی شرط پر تھا، لہٰذا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تاکید کی کہ جہاد کے ذریعہ اس زمین کو حاصل کرلو تب پوری قوم نے بہانے بنائے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کو ٹھکرایا اور اللہ کے فرمان کو مذاق میں اڑایا، اس پر اللہ کی طرف سے ان پر یوں پھٹکار برسی، توریت کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "مجھے اپنی حیات کی قسم جب تک خداوند کے جلال سے ساری زمین معمور ہوتی رہے گی، جس کسی نے میرا جلال دیکھا اور ان معجزوں کو بھی دیکھا جو میں نے مصر میں اور اس بیابان میں کیے لیکن میرا حکم نہ مانا اور دس بار مجھے آزمایا ان میں سے ایک شخص بھی اس ملک کو ہرگز نہ دیکھ پائے گا جسکو دینے کا وعدہ میں نے قسم کھا کر ان کے باپ دادا سے کیا تھا"۔

مزید یہ بھی سن لیں: "پھر خداوند نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سے کہا آخر کب تک یہ شریر قوم میرے خلاف بڑبڑاتی رہے گی، میں نے

ان بڑبڑانے والے اسرائیلیوں کی شکایتیں سن لی ہیں، سوتم ان سے کہدو مجھے میری حیات کی قسم میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جس پر تم نے مجھے مجبور کردیا ہے، تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہ جائیں گی .....تمہاری اولاد چالیس سال تک یہاں گلہ بانی کرتی رہے گی اور تمہاری بدکاری کا پھل پاتی رہے گی جب تک کہ تمہاری آخری لاش بیابان میں پڑی پڑی گل نہ جائے، میں خداوند یہ کہہ چکا، اور میں اس شریر قوم کے ساتھ جو میری مخالفت پر ایکا کرچکی ہے یقیناً ایسا ہی کروں گا، ان کا خاتمہ اسی بیابان میں ہوگا، اور وہ یہیں مریں گے''۔ (گنتی ۱۴:۲۱-۳۵)

ایک اور جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں: ''میں تجھے یعنی ابراہام اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا سارا ملک جس میں اب تو ایک پردیسی ہے ایک دائمی میراث کے طور پر بخشوں گا اور میں ان کا خدا ہوں گا، تب خدا نے ابراہام سے کہا کہ تو میرے عہد کو ضرور ماننا، اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت اسے مانے''۔ (پیدائش-۱۷:۹)

یہاں اگرچہ عہد سے مراد ختنہ کرنیکا عہد ہے، لیکن اتنا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمین کی میراث اللہ سے کیے ہوئے عہد کی تکمیل کے ساتھ وابستہ تھی، توریت کے بعض مقامات پر کھلم کھلا اس کا اعلان ہے کہ اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو اگر توڑا جائے گا تو پھر اس سرزمین پر ان کا کوئی حق نہیں ہوگا، وہ وہاں سے بھگادیے جائیں، ایک جگہ یہ الفاظ مرقوم ہیں: ''لیکن اگر تم میری نہ سنو گے اور ان سب احکام پر عمل نہ کروگے اور میری شریعت کو مسترد کروگے اور میرے قوانین سے نفرت کروگے، میرے تمام احکام کی تعمیل میں ناکام رہوگے اور یوں میرے عہد کی خلاف ورزی کروگے، تو میں تمہارے ساتھ اس طرح پیش آوں گا کہ ناگہانی دہشت کہلانے والی بیماریاں اور بخار تم میں بھیج دوں گا .....اور میں تمہارا مخالف بن جاوں گا، لہٰذا تم اپنے دشمنوں سے شکست کھاؤ گے اور جو تم سے نفرت کرتے ہیں تم پر حکمرانی کریں گے اور جب کوئی بھی تمہارا تعاقب نہ کررہا ہوگا تب بھی تم بھاگو گے''۔ (احبار/۲۶:۱۴-۱۷)

یہ بھی الفاظ موجود ہیں: ''میں تمہیں قوموں میں پراگندہ کردوں گا، میں اپنی تلوار کھینچ کر تمہارا تعاقب کروں گا، اور تمہارا ملک سونا ہوجائے گا اور تمہارے شہر کھنڈرات بن جائیں گے''۔ (احبار/۲۶:۳۳)

''تم میں اپنے دشمنوں کے مقابل کھڑا ہونے کی ہمت نہ ہوگی اور تم غیر قوموں کے درمیان فنا ہوجاؤ گے اور تمہارے دشمنوں کی زمین تمہیں کھاجائے گی''۔

یہ الفاظ بھی بہت غور کرنے کے قابل ہیں:

''لیکن اگر وہ اپنے باپ دادا کے گناہوں کا اعتراف کریں گے یعنی اگر وہ اپنی اس دغابازی اور اپنے اس معاندانہ رویّے کا اعتراف کریں جس کے باعث میں بھی ان کا ایسا مخالف ہوا کہ میں نے انہیں ان کے دشمنوں کے ملک میں بھیج دیا.....اور جب وہ اپنے گناہ کی سزا بھگت لیں گے تو میں اپنا عہد جو میں نے یعقوب علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور ابراہام علیہ السلام کے ساتھ باندھا تھا یاد کروں گا اور اس ملک کو بھی یاد کروں گا کیونکہ وہ زمین ان سے چھوٹ جائے گی .....اور وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتیں گے کیونکہ انہوں نے میری شریعت کو مسترد کیا اور میرے احکام سے نفرت کی''۔ (احبار/۲۶:۴۰-۴۳)

توریت کی یہ صراحتیں چیخ چیخ کر یہ بتا رہی ہیں کہ سرکش، نافرمان اور مفسدین کے لیے اس عہد کا کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کے عہد کو توڑنے والوں کے لیے ارض مقدس ہی نہیں بلکہ زمین کا کوئی بھی گوشہ نہیں، عہد توڑنے والوں کی قسمت میں دردر کا بھکاری بننا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

الله کا لیا ہوا اہم ترین عہد، حضور اکرم ا پر ایمان

ایمان: موجودہ تحریف شدہ توریت سے آج تک یہ بات مٹائی نہ جاسکی کہ جب ''وہ نبی'' آئے گا تو اس کی بات ضرور ماننی پڑے گی، گویا یہ اللہ کی طرف سے لیا ہوا اہم ترین عہد تھا جس کی تکمیل نہ ہونے کی صورت میں وہ ان تمام بشارتوں سے محروم قرار دیے جائیں گے جو ان کو دی گئی تھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

''خداوند تمہارا خدا تمہارے لیے تمہارے اپنے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی بات ضرور سننا'' (استثناء:۱۸-۱۵)

کچھ سطروں کے بعد یہ عبارت ہے: ''میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور انہیں وہ سب کچھ بتائے گا جس کا میں اسے حکم دوں گا، اگر کوئی شخص میرا کلام جسے وہ میرے نام سے کہے گا نہ سنے گا تو میں خود اس سے حساب لوں گا''

اہل تاریخ خوب جانتے ہیں کہ اسرائیل کے بھائی بنی اسماعیل ہیں، لہٰذا ''تمہارے اپنے بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا'' کا صاف مطلب یہی ہے کہ بنی اسماعیل میں ایک نبی مبعوث ہوں گے جو حضرت موسیٰ کی طرح صاحب شریعت نبی ہوں گے، اس کے مصداق صرف حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، اس لیے کہ بنی اسماعیل میں تنہا آپ ہی نبی ہوئے، اور ٹھیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آنحضرتا بھی صاحب کتاب اور صاحب شریعت نبی ہیں، اسرائیلی انبیاء میں کسی کو یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا نبی ہے، ادھر آنحضرتا کے بارے میں قرآن کریم کا صاف اشارہ یہی ہے کہ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی تھے، ارشاد ہے: ﴿**إنا أرسلنا إليكم رسولاً شاهداً عليكم كما أرسلنا إلىٰ فرعون رسولا**﴾ (ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر گواہ ہے بالکل ویسے ہی جیسے ہم نے فرعون کے پاس رسول بھیجا تھا)، اس آیت میں آنحضرتا کی تشبیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دی گئی ہے، بہر حال اوپر کی عبارتوں کے مجموعی مفہوم پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات خود بخود سامنے آتی ہے کہ اللہ کی شریعت کو مسترد کرنے اور اللہ کے احکام سے نفرت کرنے والوں کے لیے اللہ کے عہد کا کوئی حصہ نہیں، اور آنحضرت ﷺ کا انکار کرنا خود توریت کے لحاظ سے شریعت کو مسترد کرنا اور احکام سے نفرت کرنا ہے، پھر موجودہ یہود کیونکر ارض مقدسہ کے وارث ہوسکتے ہیں؟

خاص طور پر توریت کے یہ الفاظ بہت توجہ کے لائق ہیں: ''اگر کوئی شخص میرا کلام جسے وہ میرے نام سے کہے گا نہ سنے گا تو میں خود اس سے حساب لوں گا'' اس سے تو یہی نکلتا ہے کہ رسالتمآب ﷺ کا انکار کرنے کے بعد یہ لوگ دربار الٰہی میں لائے ہوئے مجرم ہیں نہ کہ اللہ کے پیارے اور لاڈلے۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ سے متعلق یہ پیشگوئی موجودہ توریت کے لحاظ سے ہے ورنہ قرآن کریم کی شہادت یہ ہے کہ توریت میں آنحضرت ﷺ سے متعلق پیشگوئی اس قدر صریح اور واضح تھی کہ کسی کے لیے ادنی شبہ کی گنجائش نہیں، الفاظ قرآن سماعت فرمائیں: ﴿الذين آتينا هم الكتاب يعرفونه كما يعرفون أبناء هم و إن فريقاً منهم ليكتمون الحق و هم يعلمون﴾ (جنکو ہم نے کتاب دی وہ اس نبی کو خوب پہچانتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ان کے اندر کا ایک طبقہ اچھی طرح جاننے کے باوجود حق بات کو چھپاتا ہے)۔

موجودہ تحریف شدہ توریت کی ان تصریحات کے بعد اب قرآن کریم کی طرف اپنا رخ کرتے ہیں، اللہ کی یہ آخری مبارک اور سچی کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اللہ کا عہد ذریت ابراہیم علیہ السلام میں جو ظالم ہیں ان کو بالکل حاصل نہیں ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب منصب امامت عطا ہوا تو انہوں نے دریافت کیا تھا کہ یہ منصب میری ذریت میں سے کس کو مل سکتا ہے، اس پر اللہ نے یہ جواب دیا: ﴿لا ينال عهدي الظالمين﴾ (میرا عہد ظالموں کو بالکل حاصل نہیں ہے)۔

عجیب بات یہ ہے کہ قرآن کریم ایک طرف ابراہیمی نسل کے ان ظالموں کو عہد سے خارج کرتا ہے جو ملت ابراہیمی کے حامل نہیں ہیں، دوسری طرف وہ ان تمام اہل اسلام کو ایک طرح سے ابراہیمی ذریت قرار دیتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے متبع ہوں، چاہے وہ کسی بھی نسل یا قوم سے ہوں، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تمام اہل اسلام کے باپ کے روپ میں پیش کرتا ہے، ارشاد ہے: ﴿ملة أبيكم إبراهيم هو سما كم المسلمين﴾ (اپنے باپ ابراہیم کی ملت سے وابستہ رہو، وہی ہیں جنہوں نے تمہیں مسلم کا لقب عطا کیا)، اسی طرح ایک اور جگہ تمام یہود و نصاریٰ کو ملت ابراہیمی سے خارج کر کے صرف نبی اکرم ﷺ اور اہل ایمان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سب سے بڑا حق دار قرار دیا گیا، گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیے ہوئے تمام وعدوں کا رخ اب ان کی معنوی ذریت کی طرف کر دیا گیا ہے، لہٰذا قرآن کریم کی رُو سے اصل حقدار اب اہل ایمان ہیں نہ کہ یہود و نصاریٰ اور نہ مشرکین، ارشاد الٰہی ہے: ﴿إن أولىٰ الناس بإبراهيم للذين اتبعوه و هذا النبي والذين آمنوا و الله ولي المؤمنين﴾ (ابراہیم علیہ السلام کے سب سے بڑے حقدار خود ان کے متبع ہیں، یہ نبی ہیں اور تمام اہل ایمان ہیں اللہ اہل ایمان کا ولی ہے)، یعنی اللہ کا تعلق اہل ایمان سے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بشارت: جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا تعلق ہے، اس کا ذکر قرآن کریم میں بھی موجود ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿يا قوم ادخلوا الأرض المقدسة التي كتب الله لكم و لا ترتدوا علىٰ أعقابكم فتنقلبوا خاسرين﴾ (اے میری قوم اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، الٹے پاؤں نہ آنا ورنہ تم ناکام و نامراد رہو گے)۔

اس آیت میں بلاشبہ ﴿كتب الله لكم﴾ کے الفاظ ہیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے لیکن یہ لکھنا ایمان و طاعت کی شرط پر تھا، اس لیے کہ آیت کے آخر میں یہ کہا گیا ہے: ﴿و لا ترتدوا علىٰ أعقابكم فتنقلبوا خاسرين﴾ یعنی (پیٹھ پھیر کر واپس نہ آنا ورنہ ناکام و نامراد رہو گے)، اسی طرح اس رکوع کے آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا اور اللہ رب العزت کے فیصلہ کا بھی تذکرہ ہے، قوم کی نافرمانی، بزدلی اور نکمے پن کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام خود اپنی قوم کو فاسق قرار دیتے ہیں اور یوں بددعا کرتے ہیں: ﴿رب لا أملك إلآ نفسي و أخي فافرق بيننا و بين القوم الفاسقين﴾، پروردگار میں تو بس اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں اس لیے تو میرے اور اس نافرمان قوم کے مابین جدائی پیدا فرما اس پر اللہ کا یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے: ﴿فإنها محرمة عليهم﴾ یعنی یہ زمین ان پر حرام ہے ﴿أربعين سنة يتيهون في الأرض﴾ چالیس سال تک یہ لوگ اسی وادی میں مارے مارے پھریں گے ﴿فلا تأس علىٰ القوم الفاسقين﴾ ان فاسقوں پر بالکل افسوس نہ کرو۔

فیصلہ الٰہی: اس مبارک آیت سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ فاسق و فاجر لوگوں کے لیے ارض مقدسہ کے وعدہ میں کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگ اس کے برعکس عذاب کے مستحق ہیں، قرآن کریم کے لحاظ سے یہود کا فسق اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک وہ سچے ایمان والے بن نہ جائیں مزید قرآن کریم کی شہادت یہ بھی ہے کہ یہود میں بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو ایمان لائیں گے، جب یہ بات ہے تو یہود کا من حيث القوم اس زمین پر کوئی حق نہیں بنتا، نہ موجودہ توریت کے لحاظ سے اور نہ قرآن کریم کی روشنی میں۔

قرآن نے ان کے فسق سے نکلنے کے لیے ایک ہی شرط بیان کی ہے، وہ ہے حضرت محمد ﷺ پر سچا ایمان، ارشاد ہے: ﴿ولو آمن أهل الكتاب لكان خيراً لهم منهم المؤمنون و أكثر هم الفاسقون﴾ (اگر اہل کتاب ایمان لائیں تو اسی میں ان کے لیے خیر ہے، کچھ تو ان میں ایمان والے ہیں (یعنی ایمان لا چکے ہیں یا لائیں گے) مگر اکثر ان میں نافرمان ہیں)، دوسری جگہ یوں ارشاد ہے: ﴿لعنهم الله بكفرهم فلا يؤمنون إلآ قليلاً﴾ (اللہ نے ان کے کفر کے پاداش میں ان پر لعنت کی ہے، لہٰذا وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر اِکا دُکا)، اس سے پہلے ہم واضح کر چکے ہیں کہ خود توریت میں بھی آنحضرت ﷺ کی بات ماننے کا یعنی آپ پر ایمان لانے کا ان کو حکم دیا گیا تھا، آج کی تحریف شدہ توریت میں قوی اشارات کے ساتھ یہ حکم محفوظ ہے پھر بھی ان کا دین اسلام میں داخل نہ ہونا خود توریت کے لحاظ سے ان کو ارض مقدسہ سے محروم کرتا ہے۔

(باقی صفحہ نمبر ۱۶ پر)

جہد مسلسل یا جہاد و قربانی

محمود حسن حسنی ندوی

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿و جاهدهم به جهاداً كبيراً﴾ (بذریعہ قرآن کے آپ ان سے جہاد کریں بڑا جہاد)، اور ارشاد ہے: ﴿و جاهدوا في الله حق جهاده﴾ اس آیت پر اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ اللہ کی خاطر جہد مسلسل اور سعی بلیغ سے کام لیا جائے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جہاد کا مطلب واضح کرتے ہوئے بہت خوب لکھا ہے کہ ''جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے، جہاد کا لفظ ''جہد'' سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں، اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اس کے قریب قریب اسی کے اصطلاحی معنی بھی ہیں، یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جد و جہد، قربانی اور ایثار کو گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی اور اپنے اُعزہ واقارب کی، اہل وعیال کی خاندان وقوم کی، جان تک کو قربان کر دینا، اور حق کے محافظوں اور دشمنوں کی کوشش کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا، اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے، اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے''۔ (سیرت النبی: جلد پنجم-موضوع جہاد)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی مرضی اور اس کے کلمہ کے اعلاء اور اس کے دین کے فروغ اور اس کی شریعت کی ترویج میں خوب محنت، سعی بلیغ اور جہد مسلسل سے کام لینا ہے قرآن مجید میں چونکہ جہاد کے مقابل قعود کا لفظ آیا ہے، اس لیے سستی، کاہلی، لاپرواہی، تغافل سے بچتا ہے، اور ایک لفظ کا اور اضافہ کر لیا جائے کہ بخل سے بھی بچنا ہے اس لیے جہاد اور انفاق دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور جہاد کرنے کا جب تقاضہ رکھا جاتا ہے تو ﴿بأموالهم و أنفسهم﴾ جان و مال استعمال میں لانے کے ساتھ اس کا مطالبہ ہوتا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص محنت، جہد مسلسل اور جہاد و قربانی سے کام لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا، اللہ کو کسی کے جہاد و قربانی اور محنت و کوشش کی ضرورت نہیں، وہ ذات بڑی غنی اور صمدیت والی ہے، اور اس نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ ﴿و من جاهد فإنما يجاهد لنفسه، إن الله لغنيٌ عن العالمين﴾ ہر شخص کا جہاد درحقیقت اولاً اسی کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

جہاد کے مراحل ہیں، پہلا مرحلہ علم ہے، اور سچ پوچھئے تو آج دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ ''اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لیے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی، جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے'' (سیرت النبی جلد پنجم: جہاد)

اسی لیے ارشاد ہے: ﴿أدع إلىٰ سبيل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة و جادلهم بالتي هي أحسن﴾ (سورہ نحل) (لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دیجئے، اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کریئے)۔

اور علم کی یہ اہمیت ہے کہ ﴿و جاهدهم به جهاداً كبيراً﴾ یعنی قرآن مجید کے ذریعہ جہاد کرنے اور بڑے زور کا مقابلہ کرنے کو کہا گیا، اس طرح جہاد کی یہ تین بڑی قسمیں ہوئی، جہاد بالعلم، جہاد بالنفس اور جہاد بالمال، اور کلمہ حق کو بلند کرنا جیسے حدیث میں آیا ہے ''إن من أعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر'' (ترمذي أبواب الفتن)۔ اسی طرح والدین کی خدمت پر مامور کرتے ہوئے فرمایا: ''ففيهما فجاهد'' (تم تو انہی کی خدمت میں جہاد کرو) (ترمذي و أبوداود: كتاب الجهاد)، اور عورتوں کو خصوصی رعایت دیتے ہوئے ان کے حج کو ان کا جہاد قرار دیا، فرمان نبوی ہوا کہ تمہارا جہاد نیک حج ہے۔ (صحيح البخاري: كتاب الجهاد) قتال اور جہاد بار بار پیش نہیں آیا کرتے لیکن حق کی راہ میں جہاد کی برابر ضرورت ہے، اس لیے ایک مؤمن کو جہد مسلسل کے بغیر جینا نہیں ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ کہتے ہیں کہ ''ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیر دستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف و نهی عن المنكر، اقامت عدل، رد ظلم اور احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورہ آل عمران کی آیت جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں: ﴿يا أيها الذين آمنوا اصبروا و صابروا و رابطوا و اتقوا الله لعلكم تفلحون﴾ (کہ اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ اور کام میں لگے رہو، خدا سے ڈرو شاید تم مراد کو پہنچو)، یہی وہ جہاد محمدی ہے جو مسلمانوں کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے''۔ (سیرت النبی جلد پنجم: جہاد)

جہادِ حرب کا مرحلہ آخری مرحلہ ہوتا ہے، جب گفت و شنید کی صورت باقی نہیں رہتی، ظالم اپنے آلات حرب کے ساتھ کود پڑتا ہے، یا یہ کہ ہر صورت میں وہ

ظلم واستبداد کی تاک میں رہتا ہے، یا یہ کہ دشمن کسی کی زمین واقتدار پر قبضہ کرنے لگے اور حملہ آور ہو جائے، اور آج کے دور میں حملہ آوری، اقتدار پر قبضہ اور ظلم و استبداد کی شکلیں کچھ زیادہ ہی ایڈوانس ہوگئی ہیں، اور میڈیا کے ذریعہ صاحب حق اور مظلوم کو ظالم، دہشت گرد، انتہا پسند، جنونی، بنیاد پرست، غاصب باور کرایا جاتا ہے، اور بار بار مذاکرات کی دعوت دے کر مسئلہ وقضیہ کو سرد خانہ میں ڈال کر اس کی طرف سے توجہ ہٹائی جاتی ہے، اور دوسرے مسائل کو اہمیت دے کر توجہ باٹ دی جاتی ہے، یہ ایسی جنگی صورتحال ہے جس کا مقابلہ ایسی ہی طریقوں اور اس قسم کے وسائل حرب سے کرنا ہوگا، جس کے لیے علم جدید اور ٹیکنالوجی سے واقفیت حاصل کرنی ہوگی جب کہ ہر قسم کے جہاد کے لیے علم کا درجہ پہلا درجہ ہے، اس لیے کہ بغیر علم کے کوئی بھی عمل صحیح شکل میں اور اسوۂ نبوی کے مطابق سامنے نہیں آسکتا، اور امت محمدی کے لیے تمام افعال وآثار واعمال میں کامیابی اور غلبہ اسوۂ نبوی کو اختیار کرنے اور اندرونی طور پر دل و دماغ کی مضبوطی اور اعتماد علی اللہ نہ کہ وسائل و آلات حرب اور اسباب جہاد وقتال پر بھروسہ کیا جائے اور انسانیت نوازی، عدل پروری کہ ﴿لا یجرمنکم شنآن قوم.....الخ﴾ اور پورے حلم وصبر وضبط سے کام لینا پڑتا ہے، تب ضمانت ﴿و أنتم الأعلون إن کنتم مؤمنین﴾ کی ہے، سب سے بڑھ کر مقصد کا صحیح ہونا، کہ دل اللہ کے عشق ومحبت سے معمور ہو اور وہ خود اسی میں سرشار ہو اور مقصد اعلاء کلمة اللہ اور غلبہ دین وشریعت ہو، دین وملت کے آگے قومیت ووطنیت، لسانیت، شعبیت کو کرنا یہ ایسی غلطی ہوتی ہے کہ جو اللہ کی نصرت سے دور کر دیتی ہے، جب اسلام کا نام لیا جائے گا، اور جہاد اسلامی کا نعرہ دیا جائے گا تو پھر پورے اسلامی اصول کو بروئے کار لانا ہوگا، علم وعمل کے ساتھ اہم ترین مرحلہ دعوت حق اور تبلیغ دین کا ہے، اظہار صداقت وحق کا ہے اور اس میں اگر نفاق سے کام لیا جائے گا، پھر یہ عمل اسلامی نہیں رہے گا، آج امت مسلمہ کو جن چیلنجز کا سامنا ہے اور جن مشکلات سے گزرنا پڑ رہا ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ اسلام کے کام کا آغاز تو کر دیا جاتا ہے لیکن اسلامی اصولوں سے ہٹ کر اور اسوۂ نبوی واسوۂ صحابہ کو نظر انداز کر کے مقاصد کے حصول میں کوشش کی جاتی ہے تو یہ عمل نفع کا باعث ہونے کے بجائے خسارہ کا سبب بن جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ اور سیرت پاک کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اعلاء کلمة اللہ کے لیے جہد مسلسل کے عمل اور وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کے جذبہ سے عبارت نظر آئی گی، جس میں حق اور سچائی کی خبر دینا، پھر حق کی طرف بلانا، اور ان باتوں کے سمجھ میں نہ آنے والوں کی طرف سے ایذاء رسانی کو برداشت کرنا، اپنے انفرادی اعمال واشغال پر قائم رہنا، اور ساتھ میں اپنے ساتھیوں کو عبادت وصبر کی تلقین کرتے رہنا، ترک وطن اور ہجرت ناگزیر ہو جانے کی صورت میں اس کا مشورہ دینا، اور بالآخر خود بھی وطن کو خیر آباد کہہ دینا اور اس پر بھی حق کے پھیلنے اور دوسروں تک حق کی بات پہنچنے میں لوگوں کے رکاوٹ بننے کو افہام وتفہیم کے ذریعہ باز آنے کو کہنا، اور کسی بھی صورت میں لوگوں کے باز نہ آنے پر پھر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی استعداد بھر مقابلہ پر آمادہ ہو جانا نظر آئے گا، لیکن اس صورتحال میں تعلق مع اللہ، عبادت و بندگی، دعا ومناجات اور ایمان ویقین، صبر واستقامت اور اللہ کے لیے فدائیت کے وہ جھونکے نظر آئیں گے جس نے دشمنوں کے خیموں، ان کے آلات حرب ووسائل مقاومت کو اکھاڑ پھینکا۔

اسی طرح جنگی صورتحال کا سامنہ کرنے اور امن وسلامتی سے دور ماحول و معاشرہ کا مقابلہ کرنے کی صورت میں آپ ﷺ کا اسوہ، پہلے دعوت وتبلیغ، تفہیم و تلقین اور ارشاد وموعظت کا ہے، پھر ہجرت کا ہے اور پھر آلات حرب سے مسلح ہونے اور رعب وداب قائم کرنے کا ہے، اور آخری درجہ قتال اعداء کا ہے، اس میں بھی کمزوروں، بچوں، عورتوں، بوڑھوں، مریضوں کی رعایت کا ہے۔

لیکن آج جس صورتحال کا پورے انسانی معاشرہ کو سامنا ہے اس میں جنگی پیمانے بالکل بدل گئے ہیں، اور ہوس واقتدار کے نشہ میں طاقتور کمزور کو کھا لینے کی فکر میں اسی طرح لگا ہے جس طرح زمانہ جاہلیت میں دنیا کو سامنا تھا۔

یہ ایک ایسی صورتحال ہے جس سے نمٹنا آسان نہیں، خاص طور سے اس وقت فلسطین کا مسئلہ تمام مسائل کے گرد گھومتا نظر آئے گا، دنیا کے بڑے بڑے مذاہب اور اقوام نے اسے اپنا اپنا مسئلہ بنا رکھا ہے، اور تمام مسائل کو اسی سے جوڑ دیا ہے، اس میں دورخی پالیسی، سازشیں، ظلم واستبداد، اقتصادی حربے سبھی کچھ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اختیار کیے جا رہے ہیں، اور ایک دوسرا ظالمانہ حربہ ہر غلط چیز سے اسلام اور مسلمانوں کا انتساب کر کے خود بھولا بن جانے کا مسلسل اختیار کیا جا رہا ہے، مغربی میڈیا جس کی سرپرستی اسرائیل اور اس کے مفاد سے جڑے ممالک بشمول امریکہ کر رہا ہے، آج دنیا میں سارے شر وفساد کا ذمہ دار ہے، آج سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ دنیائے انسانیت کو ان کے شر وفساد سے نکالا جائے اور یہ ذمہ داری مسلمانوں کی ہے کہ ان کو پوری انسانیت کی ہدایت کے کام پر مامور کیا گیا ہے اور وہ اس نبی آخر الزماں کی امت ہیں جن کی بعثت ساری انسانیت کے لیے تا قیامت ہے، آج دنیا میں فحاشی، بے حیائی، عریانیت، شرک وکفر والحاد وزندقہ، ظلم واستبداد، عالمی بینکوں کی شکل میں دوسروں کی دولت ہڑپ کرنا، سود کے شکنجہ میں ہر ایک کو جکڑ دینا، قتل وخونریزی، سفاکیت، مال کی حد سے بڑھی محبت، انسانیت کے بغیر فائدہ کے کام نہ آنے کا مزاج، ناپ تول میں کمی دھوکہ، فریب دہی اور جھوٹ پر سارا کاروبار معیشت پوری انسانیت کو تباہی کے دہانے پر ڈال چکا ہے، حقوق انسانی کے نام پر انسانی حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے، علاج کے نام بیمار ڈالا جا رہا ہے، دوا کے نام پر زہر پلانے کا کام کیا جا رہا ہے، کون ہے جو اس کے خلاف آواز اٹھائے، غلط کو غلط کہے، برے کو برا بتائے، اور اس میں کسی مرعوبیت اور جھجک وشرم سے کام نہ لے، جب ایسا کرنے والا اپنے خالق ومالک حقیقی اللہ رب العالمین سے شرم نہیں کر رہے ہیں اور اس کا خوف نہیں کھا رہے ہیں، تو کیوں ان سے جھجکا جائے، ان منکرات و فواحش اور ظلم واستبداد کو دل سے بڑا سمجھنا ہے۔ اور ان کے خلاف آواز اٹھانی ہے، اور انسانی سماج کو ان سے پاک کرنا ہے، یہ آج کا عظیم جہاد ہے۔

جہاد پہلے دل سے ہوتا ہے، پھر دماغ سے پھر زبان سے اور زبان کی تحریری قسم قلم سے اور آج کے الکٹرانک دور میں کمپیوٹر انٹرنیٹ نے اس کی ترقی یافتہ شکل اختیار کر لی ہے، اور مال ودولت سے اور پھر پورے تن من دھن اور تمام حاصل شدہ وسائل وذرائع اور اسباب سے پہلے دل سے ان حالات کو برا سمجھا جائے گا جن

کے خلاف جنگ چھیڑنی ہے، پھر دماغ پلاننگ کرے گا اور منصوبہ بنائے گا، ترکیبیں سوچے گا، آج جن قوموں کا عروج واقتدار اور غلبہ نظر آرہا ہے، وہ یوں ہی اتفاقی طور پر غالب نہیں ہوئے، کتنی کتنی صدیوں سے انہوں نے دماغی جنگ چھیڑ رکھی تھی، صہیونیت کی پلاننگ اور سازشوں پر مشتمل کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ان کے پروٹوکول ڈھکے چھپے نہیں رہے، لیکن یہ اس وقت ظاہر ہوئے جب انہیں اپنے غلبہ اور کامیابی کا یقین ہو چلا۔

فلسطین کا مسئلہ مسلسل سازشوں کا شکار ہوتا رہا، ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا جنم ہو یا ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ، اور پھر مسلسل حوادث، اور اسلامی جذبہ سے فلسطینی کاز کے لیے حماس کی کوششیں ہوں، اخوان المسلمین کی حمایتیں ہوں، بلاد عربیہ اور ممالک اسلامیہ کی کانفرنسیں ہوں، اور امریکی و یورپین کنٹریز کے ساتھ مذاکرات ہوں، بڑے زور وشور سے شروع ہو کر کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر اختتام پذیر ہوتے رہے، یہ مسئلہ صرف قومی مسئلہ نہیں کہ بلاد عربیہ ہی اس کو طے کریں گے، خالص مذہبی و دینی مسئلہ بھی نہیں صرف ممالک اسلامیہ اس کے ذمہ دار ہیں، اور دینی و اسلامی تحریک اور جماعتیں ہی اس کے مسئلہ کا حل ڈھونڈھ سکتی ہیں، یہ ایک انسانی مسئلہ ہے، دنیا کی ہر برادری، ہر قوم، ہر ملک، ہر آبادی اور دنیا کے سارے دانشور اور مفکرین کی ذمہ داری ہے کہ وہ مظلوم کی حمایت میں آگے بڑھیں اور ظالم کا ہاتھ پکڑیں، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آدمی اپنی زمین پر اور اپنے وطن میں ہی اجنبی اور قیدی بن جائے، محاصرے کیے جائیں، پانی، خوراک کا راستہ منقطع کیا جائے، اور پوری دنیا خاموش تماشائی بنی رہے، اور بے نتیجہ مذاکرات جاری رکھے، آج اسرائیل اور امریکہ کے گٹھ جوڑ نے پوری دنیا کو اقتصادی جال میں پھنسا کر اپنے اہداف و مقاصد کے حصول کو آسان ضرور بنا لیا ہے، لیکن انسانیت کے لیے یہ خوشخبری ہے کہ یہ اپنے ڈالے ہوئے جال میں اب خود پھنس رہے ہیں، اور ان کی ہر چال ان کے خلاف جاتی نظر آرہی ہے، عراق، افغانستان پر ان کے حملوں نے خود انہی کو کاری ضرب لگائی ہے، اب اس وقت مسلمانوں کو جہاد علمی اور جہاد عملی کی شدید ضرورت ہے، ذہن سازی کا کام غزوہ فکری کی شکل میں بڑا محاذ جنگ ہے، اور دعا و دعوت دو بڑے ہتھیار ہیں جن سے اگر جنگی پیمانہ پر کام لیا جائے تو اس امت کے سامنے ۳۱۳ کا واقعہ پھر پیش آئے گا، اور فتح مبین دور نہیں رہے گی، رسول اللہ ﷺ نے بے سروسامانی اور قلت عدد کے ہوتے ہوئے دعا کی تھی: "اللّٰھم إن تھلک ھذہ العصابة لا تعبد" (الٰہی مٹھی بھر جماعت اگر ہلاک ہو جاتی ہے تو پھر زمین میں تیری عبادت نہ ہو پائے گی)، امت کے وجود و بقا کی یہی ضمانت ہے اور قرآن مجید نے بھی اسی کو مقصد تخلیق بتایا ﴿و ما خلقت الإنس و الجنّ إلا لیعبدون﴾ اللہ کی بندگی واطاعت، اس کے اوامر کی بجا آوری اور اس کے منہیات سے بالکلیہ اجتناب، اس طرح دین و شریعت اپنی زندگی میں عمل میں لا کر دوسروں کی زندگیوں کو اس کے مطابق بنانے کا عمل برابر جاری رکھنا ہے، اس سے ہٹ کر سوچنا اور دیکھنا یہ حماقت ہے، اور یہ ایسا جہاد ہے جو جہد مسلسل اور پے در پے قربانیاں چاہتا ہے، اسلامی جہاد کی تاریخ اسی سے بھری ملے گی، اور جب جب جان کی بازی لگانے کا وقت آیا تو انفرادی طور پر جو بن پڑا کیا اور کمزوری نہیں دکھائی، اور ضرورت ہوئی تو اجتماعی طور پر ایک نظام و تنظیم اور امارت کے تحت اسے بھی کر دکھایا۔

بقیہ : ارض مقدس قرآن کریم کی روشنی میں

آخری بات: چلتے چلتے یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہود عالمی دعوت و پیغام نہیں رکھتے ہیں، ان کا موجودہ دین خالص نسلی ہے، اسی کے تناظر میں وہ اقوام عالم کو دیکھتے ہیں، دوسری طرف جس زمین پر ان کا ناجائز قبضہ ہے اللہ نے اس کی برکتیں سارے جہانوں کے لیے رکھی ہیں، اس زمین کو اللہ تعالیٰ ﴿الأرض التي بارکنا فیھا للعالمین﴾ کہتا ہے، یعنی وہ زمین جس میں ہم نے سارے جہانوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں، اس لیے خالص عقلی طور پر بھی سوچا جائے تو بھی وہ مبارک زمین اہل اسلام کی قرار پاتی ہے، اس لیے کہ وہ زمین عالمی ہے، سارے عالم کے لیے ہے، اس کی حقدار وہ قوم ہونی چاہیے جو سارے عالم کے لیے پیغام رکھتی ہو، جس کے نبی تمام جہانوں کے لیے مبعوث ہوئے ہوں، جس کی کتاب تمام جہانوں کے لیے کتاب ہدایت ہو، یہ تمام اوصاف اہل اسلام میں پائے جاتے ہیں، مسلمان اس خدا کو مانتے ہیں کو جو کسی نسل کا خدا نہیں بلکہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے، ﴿الحمد للہ رب العالمین﴾ (ہر تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے)، مسلمان اس رسول کا کلمہ پڑھتے ہیں جو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے ﴿و ما ارسلناک إلاّ رحمة للعالمین﴾ (ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)، مسلمان اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو سارے جہانوں کے لیے ذکر و نصیحت ہے ﴿إن ھو إلاّ ذکر للعالمین﴾ ﴿وما ھو إلا ذکر للعالمین﴾ یہ کتاب تو بس سارے جہانوں کے لیے نصیحت و پیغام ہے۔

مسلمان خود بھی عالمی امت ہیں، ﴿کنتم خیر أمة أخرجت للناس﴾ (تم بہترین امت ہو جو تمام انسانوں کے لیے برپا کیے گئے ہو)، غور کیجئے، عالمی زمین کے لیے عالمگیر امت مناسب ہے یا نسل پرست متعصب اللہ کی ٹھکرائی ہوئی قوم؟

یہ سرزمین ارض مقدس ہے اور یہود کے بارے میں ارادہ خداوندی یہ ہے کہ ان کو پاکیزگی عطا نہیں کی جائے گی ﴿أولٰئک الذین لم یرد اللہ أن یطھر قلوبھم﴾ (یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے یہ نہیں چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک وصاف کرے)، لہٰذا پاکیزہ زمین ان ناپاک لوگوں کے ہاتھ میں دیر تک نہیں رہ سکتی، ناپاک لوگوں کے لیے ناپاک چیزیں ہوتی ہیں اور پاک لوگوں کے لیے پاکیزہ چیزیں ہیں، ﴿الخبیثات للخبیثین و الخبیثون للخبیثات و الطیبات للطیبین و الطیبون للطیبات﴾ (ناپاک چیزیں ناپاک لوگوں کے لیے ہیں، اور ناپاک لوگ ناپاک چیزوں کے لیے ہیں، پاک وصاف چیزیں پاک وصاف لوگوں کے لیے ہیں اور صاف وستھرے لوگ صاف ستھری چیزوں کے لیے ہیں)۔

اللہ ہمیں طیب و طاہر بنائے اور وہ یوم طیب ہمارے زندگی میں لائے جب ہم ارض مقدس کو طیبین کے ہاتھوں میں دیکھیں اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں ﴿إن الأرض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ و العاقبة للمتقین﴾

قرآن، ارض فلسطین اور یہود

محمد سمعان خلیفہ ندوی

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری اور زندہ جاوید کتاب ہے۔ گذشتہ تمام آسمانی کتابیں اپنے اپنے وقت کے لیے محدود تھیں، مگر قرآن کریم کو ابدیت اور عالمگیریت عطا کی گئی۔ قرآن کریم کو یہ مقام عطا کیا گیا کہ اب وہی حق و باطل کی کسوٹی ہے؛ جو چیز اس کے معیار پر کھری اترے گی وہی کھری، باقی سب کھوٹی۔ قرآن کریم کو یہ اعزاز ملا کہ جو اس نے بتایا وہی صحیح اور حق، باقی سب جھوٹ اور باطل۔ قوموں کے عقائد اور ان کی تاریخ کو پرکھنے کا بھی وہی پیمانہ۔ اپنی اپنی کتابوں میں جن تحریفات کا قوموں نے ارتکاب کیا قرآن کریم نے آکر ان کا پردہ چاک کردیا۔ بنی اسرائیل کے متعلق بھی قرآن کا فیصلہ ہے کہ ان کے اختلافات کا حل بھی اسی کے پاس ہے، ان کو ان کی صحیح تاریخ بھی وہی بتائے گا۔

قرآن کریم میں عبرت کے لیے جہاں بہت سی قوموں کا تذکرہ ہے وہیں بنی اسرائیل کا بھی تذکرہ اور بار بار تذکرہ کیا گیا ہے، دیگر قوموں کا تو محض اس انداز میں ذکر ہے کہ تاریخ میں اس طرح کی قومیں گزری ہیں جن کے یہ عقائد اور اس طرح کے اعمال تھے، آنے والی قومیں ان کے قصوں سے عبرت لیں اور وہی غلطی نہ کر بیٹھیں جو ان قوموں نے کی تھی کہ پھر اس کے نتیجے میں سنت اللہ اسی طرح جاری ہوگی جس طرح پچھلی قوموں پر جاری ہوئی تھی، ﴿**لقد کان في قصصهم عبرةٌ لأولي الألباب**﴾ (یقیناً ان کے قصوں میں (اور قرآن کریم کے اس طرز بیان میں بھی جو اس کے لیے اس نے استعمال کیا ہے) عقل والوں کے لیے عبرت کا کافی سامان ہے)۔ مثلاً عاد اور ثمود کا ذکر ہے تو مختصر ہی لفظوں میں۔ لیکن بنی اسرائیل کے تذکرہ میں قرآن کے طرز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے نزول سے پہلے بھی یہ قوم موجود رہی ہے، اور قرآن کے نزول کے وقت بھی روئے زمین پر موجود ہے اور آنے والی صدیوں میں بھی امت اسلامیہ کو ان سے سابقہ پڑے گا۔ قرآن کریم نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے اور صیغے بھی ایسے استعمال کیے ہیں جو ماضی و مستقبل دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان سے متعلق تفصیلات کو ذکر کرنے کے لیے قرآن کریم نے ایک سورت ہی خاص کردی، یہ الگ بات ہے کہ اور دوسرے مواقع پر بھی اللہ کے ان پر احسانات اور پھر ان کی ناشکری اور دیگر واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے مگر سورۂ اسراء ان کی فتنہ سامانیوں، شرانگیزیوں اور پھر ان پر عذاب کی شکل میں خدائی کوڑے کے برسنے اور ان کے عبرتناک انجام کا خاص طور پر ذکر کرتی ہے۔ قصہ ہی کے زیر سایہ ایک صاحب ایمان کے دل میں پوشیدہ صاف شفاف عقیدہ، والدین کے ساتھ اس کی خوش معاملگی و حسن سلوک، اپنے مال میں اس کے حسنِ تصرف، عقیدہ سے اس کے لگاؤ، اور انبیاء کی بات مان کر ان پر جاں نثاری کے نمونے اس سورت میں دکھائے گئے ہیں۔ گویا بالفاظ دیگر سورت کا پیغام یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے ان میں سے کسی چیز کی پرواہ نہ کی لہٰذا وہ غضب الٰہی کے مستحق بن گئے۔ ویسے بنی اسرائیل کا حال دنیا کی دیگر قوموں سے بالکل مختلف تھا۔ ان پر احسانات الٰہی کی اس قدر بارش کے باوجود کہ انھیں اپنے وقت میں دنیا جہاں کی تمام قوموں پر فضیلت و برتری عطا کی گئی مگر اس نافرمان و ناہنجار قوم نے اللہ کی نشانیوں کے ساتھ تمسخر کیا، پیغمبروں کو ایذائیں پہنچائیں، بعض نبیوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اللہ کے کلام میں تحریف کی جسارت کی، زمین میں اپنی شرانگیزیوں سے تباہی مچائی، اور یہی وہ جرائم ہیں جن کی بدولت اللہ عزوجل کی ان پر پھٹکار پڑی اور ہمیشہ ہمیش کے لیے ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی (**ضربت علیهم الذلة والمسكنة**)، ان کے نبیوں تک نے انھیں گالیوں سے نوازا، اتنی تحریفات کے باوجود آج تک ان کی کتابوں میں ان کے حق میں نبیوں کی یہ گالیاں موجود ہیں، ان کی انھیں حرکتوں سے امت محمدیہ کو واقف کرانے کے لیے کتاب اللہ کی آیتیں ان کا پول کھول دیتی ہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ﴿**انّ هٰذا القرآن يقصّ علىٰ بني اسرائيل أكثر الذي هم فيه يختلفون**﴾ (یہی قرآن بنی اسرائیل کو ان کے اکثر اختلافات کا حال سنائے گا)۔

سورہ بنی اسرائیل میں بڑے بڑے واقعات و حوادث کا بیان ہے، بنی اسرائیل کے دو مرتبہ فساد فی الارض اور سرزمین قدس میں ہمیشہ کے لیے ان کے خاتمہ کا بیان ہے۔ سورہ کی ابتدا ایسے حیرت انگیز قصہ سے ہے جس کی تفصیلات انسانی عقل کے احاطہ سے باہر ہے، جن کے اندرون میں ایمان جلوہ گر تھا اور جن کے دل ایمان و یقین کی ضوفشانیوں سے منور تھے انہوں نے پہلے مرحلہ ہی میں سرِ تسلیم خم کردیا اس لیے کہ اس سے بڑی عظیم الشان حقیقت کو وہ دل و جان سے قبول کر چکے تھے، البتہ جن لوگوں نے واقعۂ معراج کو اپنی کوتاہ عقلوں کے دربار میں پیش کیا اور اپنے ناقص علم کی میزان میں اس کو پرکھنا چاہا، انہوں نے اس کو محال سمجھا اور اس کا انکار کیا، اس لیے کہ ان کی عقلیں اس طرح کی خبروں کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ اسی لیے سورہ کی ابتدا ایسے لفظ سے کی گئی جو انھیں ایمان کی حقیقت کی طرف لے آئے، جو انھیں خالق اور مخلوق اور اللہ اور بندوں کا فرق سمجھائے، اور ان کے سامنے قدرتِ الٰہی اور انسانی بے بسی اور عاجزی کے

درمیان لکیر کھینچ کر رکھ دے: ﴿سبحٰن الذي أسریٰ بعبدہ لیلاً﴾ (پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندۂ خاص کو (اپنی معیت خاصہ کے ساتھ) راتوں رات لے گئی)، اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کو اسراء اور معراج کے سفر پر لے جانے کا بیان ہے، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا اسی کو اسراء کہتے ہیں، پھر وہاں سے آسمانی سفر کی ابتدا ہوئی جس کا نام معراج ہے۔

مسجد حرام انسانوں کے لیے اللہ رب العزت کی عبادت کا پہلا مرکز اور روئے زمین پر قائم ہونے والی پہلی مسجد ہے۔ مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے، اور مسجد حرام اور مسجدِ نبوی کے بعد وہ تیسرا حرمِ مبارک ہے، مگر تعمیر کے اعتبار سے مسجد حرام کے بعد مسجد اقصیٰ وہ دوسری مسجد ہے جو روئے زمین پر قائم کی گئی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا: یارسول اللہ! روئے زمین پر سب سے پہلی مسجد کون سی ہے؟ فرمایا: ''مسجد حرام''، پھر عرض کیا: اس کے بعد کون سی؟ ارشاد فرمایا: ''مسجد اقصیٰ''، پھر دریافت کیا: دونوں کی تعمیر کے دوران کتنا وقفہ رہا؟ فرمایا: ''چالیس سال، اور جہاں تمھیں نماز مل جائے ادا کرلو، فضیلت مل جائے گی''۔ روایتوں کے مطابق بیت اللہ کے معمارِ اول حضرت آدم علیہ السلام ہیں، مسجد اقصیٰ اس کے چالیس سال بعد بنائی گئی، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے مسجد اقصیٰ تعمیر کی جا چکی تھی؛ ممکن ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی دوبارہ بنیاد اٹھائی اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے دوبارہ مسجد اقصیٰ کی بنیاد اٹھائی ہو۔

آخر کیا بات ہے کہ آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا، جب کہ اس وقت بیت المقدس رومیوں کے قبضہ میں تھا، اور یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بیت المقدس فتح ہوا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت جو معاہدہ اور فرمان جاری کیا قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں آج بھی وہ اہمیت رکھتا ہے۔ بیت المقدس کے رومیوں کے قبضہ میں ہوتے ہوئے معراج کے وقت وہاں لے جانے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی؟ اور آنحضرت ﷺ نے انبیاء کی وہاں پر امامت کی جن میں آدم علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے، اس امامت کا کیا مطلب؟

مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں مسجدوں کا ایک ساتھ ذکر کر رہی یہ آیت' سورۂ اسراء کے شروع میں کیوں لائی گئی؟ غور کرنے کے بعد اس کے بڑے دور رس معانی سمجھ میں آتے ہیں۔ مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کا وجود ایک ہے، دونوں کا دین ایک ہے، جو بھی دونوں کے مشترک عقیدہ کی وحدت پر دست درازی کرے گا اس کی خبر لینے کے لیے، شب معراج میں اپنے بندۂ خاص' خاتم الانبیاء کو دونوں جگہ لے جانے والا خدا قیامت تک لوگوں کو کھڑا کرتا رہے گا، اور اس طرح دونوں کے درمیان اتحاد باقی رکھے گا۔ اس کا صاف مطلب یہ بھی ہے کہ انبیائی عقیدہ کے اس اشتراک کی وجہ سے اور بنی اسرائیل کی اپنی نافرمانی وسرکشی کی بدولت استحقاق کھو دینے کی وجہ سے اب امت محمد یہ ان مقدسات کی امین ووارث ہوگی، اسراء کا یہ سفر اسی حقیقت کا اعلان تھا کہ سابقہ انبیاء کے مقدسات کی امانت اب خاتم الانبیاء کی امت کے حوالے کی جارہی ہے، ان کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر رکھی جارہی ہے۔

مسجد اقصیٰ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اللہ کی طرف سے وہ بھی بابرکت اور اس کے اطراف بھی بابرکت ہیں۔ اس کے اطراف میں شام کا پورا علاقہ، فلسطین، اردن، سیریا اور لبنان سب شامل ہیں، تاریخِ اسلام کے ہر دور میں یہ علاقے شام میں رہے ہیں، یہ جدید جغرافیائی حد بندیاں اسلام دشمن طاقتوں کی سازشیں تھیں جن کے ذریعے اہل اسلام کو کمزور کرنے کی اور ان کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی گئی، ان جغرافیائی حد بندیوں نے مسلمانوں کو خانوں میں بانٹ دیا، اور ایک دھڑکو متعدد ٹکڑوں میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

قدس کی سرزمین انبیاء کی سرزمین ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن یہیں گزرا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اسحاق علیہ السلام یوسف علیہ السلام، اور بعض اقوال کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبریں بھی یہیں، حرم ثالث مسجد اقصیٰ بھی یہیں، قیامت تک کفر واسلام کی سرحد والی سرزمین بھی یہی، احادیث کے مطابق حشر ونشر بھی یہیں ہوگا۔ حدیثوں میں صاف آتا ہے کہ قیامت کے قریب آخری وقت میں ملک شام میں قیام اللہ کے راستے میں جہاد ومجاہدہ سمجھا جائے گا۔

قرآن کریم میں تین جگہوں پر ''الأیمن'' کا لفظ آیا ہے (جس کے معنی ہیں: بابرکت)، ﴿ونادیناہ من جانب الطور الأیمن﴾ ﴿قد أنجیناکم من عدوّکم ووٰعدناکم جانب الطور الأیمن﴾ ﴿فلما أتاھا نودي من شاطئ الواد الأیمن في البقعۃالمبارکۃ﴾، تینوں موقعوں پر ارض فلسطین مراد ہے۔

قرآن کریم نے ''مبارک'' کا لفظ اکثر موقعوں پر اپنے تعارف کے لیے استعمال کیا ہے، وہیں اس سرزمین کے لیے بھی ''البقعۃ المبارکۃ'' کہنا اس کے تقدس پر مہر ثبت کر دیتا ہے۔ انسانوں میں سب سے معزز شخصیتیں انبیاء کرام کی ہیں، ان عظیم اور معزز شخصیتوں کی پابوسی کا شرف قدس کی سرزمین کو ہزاروں ہزار بار حاصل ہوا ہے۔ ''برکۃ'' کے مفہوم میں خیر اور اس خیر میں روز افزوں اضافہ کا مفہوم پوشیدہ ہے اسی لیے خیر وبرکت والے پانی (یعنی بارش کے پانی) کے لیے قرآن نے ''ماءً مبارکاً'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور سیاروں میں تنہا زمین ہی کے لیے اس لفظ کا انتخاب کیا گیا (وبارک فیھا وقدّر فیھا أقواتھا)، کیوں کہ صرف اسی پر زندگی اور اس میں روز افزوں اضافہ کے سامان حق تعالیٰ کی طرف سے رکھے گئے ہیں۔

سرزمین قدس کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ قرآن کریم نے تقریباً تین بار اس کے لیے ''بارکنا فیھا''، ایک بار ''بارکنا حولہ''، ایک بار ''بورک''، ایک بار ''البقعۃ المبارکۃ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ درختوں میں جس درخت کو قرآن کریم نے ''شجرۃ مبارکۃ'' کہا ہے وہ درخت بھی ارض قدس کی خوش قسمتی ہے کہ خاص اسی کی پیداوار ہے۔ (کأنھا کوکبٌ درّیٌّ یوقد من شجرۃٍ مبارکۃٍ زیتونۃٍ)۔

اسی طرح قرآن کریم نے اس کو ''الأرض المقدسة'' کا بھی خطاب دیا، اور جس وادی کو ''وادیِ مقدس'' کہا وہ بھی اسی سرزمین پر واقع ہے۔

سورہ اسراء کی ابتدا میں یہود کی سرکشی اور بغاوت کا جس انداز میں ذکر ہے (جس کے بعد ﴿وان عدتم عدنا﴾ کہہ کر بھی خبردار کیا گیا) اس سے ان کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت (وإذتأذّن ربّک لیبعثنّ علیهم إلٰی یوم القیامة من یّسومهم سوء العذاب) بھی تاکید کر رہی ہے کہ یہ ہر زمانے میں سر اٹھاتے رہیں گے، اور اس وقت دنیا ان کی جن فتنہ انگیزیوں اور شرارتوں کا مشاہدہ کر رہی ہے اس سے قرآن کریم کے یہ الفاظ سو فیصد اس پر منطبق ہو رہے ہیں ﴿لتفسدنّ في الأرض مرتین ولتعلُنّ علواً کبیراً﴾ (تم زمین میں ضرور بالضرور دو مرتبہ فساد برپا کرو گے اور بہت زیادہ سر اٹھاؤ گے)، اور موجودہ زمانہ میں شاید کچھ زیادہ ہی اس بات کا ان پر انطباق ہو رہا ہے اس لیے کہ اس وقت ان کی ظالمانہ سرکشی بلکہ فرعونیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ نہتے فلسطینیوں پر ان کی طرف سے توڑے جا رہے مظالم اسرائیلی مظالم کی ایک خونیں تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔

اسرائیل کی موجودہ سرکشی اور طغیان کو سامنے رکھ کر آیئے جہاں سے گفتگو شروع ہوئی وہیں پہنچتے ہیں اور قرآن کریم کی طرف سے اہل ایمان کو سنائی گئی بشارتوں پر نظر کرتے ہیں: بنی اسرائیل کی دو تاریخی سرکشیوں کا سورہ بنی اسرائیل میں ذکر ہے، پہلی زبردست سرکشی وطغیانی کے بعد ان پر خدائی کوڑا بخت نصر کی صورت میں برس چکا ہے، جس نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، اور یہودیوں کے خون کے دریا بہا دیے تھے، پھر اور موقعے بھی آتے رہے جب جب یہودیوں نے خدا سے بغاوت کی، اور سرکشی وتمرد پر اتر آئے تو خدائی کوڑا ان پر برستا رہا، چاہے ۶۶ء میں جنرل ٹیٹس کی شکل میں ہو، یا پھر گذشتہ صدی میں ہٹلر کی صورت میں ہو۔ ان کی پہلی تباہی کے بعد ذکر ہے کہ ان میں کسی قدر سدھار پیدا ہوگا، پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی پرانی ڈگر پر واپس آنا شروع کر دیں گے، آزمائش کے لیے انھیں خوب مال ودولت سے بھی نوازا جائے گا، ﴿وأمددناکم بأموالٍ وبنین﴾ (اور ہم تمھیں مال ودولت اور بیٹوں سے بھی نوازیں گے)۔ یہودیوں کی موجودہ صورتحال پر غور کرنے والے پر یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ ان کے پاس دولت کی کس قدر ریل پیل ہے، دنیا کے بڑے بڑے بینکوں پر انھیں کا قبضہ ہے، بڑی بڑی کمپنیوں کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ یہودیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ کسی زمانہ میں بھی ان کے پاس دولت کی کمی نہیں رہی، ان کی قیادت کے سامنے مالی مسائل کبھی نہیں رہے، آج بھی ان کے لیے یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، حالات سے واقفیت رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ مال اکٹھا کرنے کے لیے چندہ کی مہم پر اسرائیل سے اگر کوئی امریکہ چلا جاتا ہے تو صرف ایک ہفتہ بھی نہیں گزر پاتا کہ اس کے پاس اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ ''أموال'' کو ''بنین'' پر مقدم رکھنے میں قرآن کی حکمت شاید یہی ہے کہ ''بنین'' (افراد) کی قوت کے مقابلہ میں ''أموال'' کی قوت انھیں زیادہ حاصل رہے گی، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے اور قرآن کی معجز بیانی کا ثبوت ہے کہ ان کے پاس ''بنین'' کی قوت مال کی قوت سے ہمیشہ کم ہی رہی ہے، اسی لیے افرادی قوت کو بڑھانے کے لیے وہ مال کی قوت کا سہارا لیتے رہتے ہیں، اور باہر سے انھیں تعاون حاصل رہتا ہے، چنانچہ موجودہ حالات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح بڑے بڑے ممالک کی سرپرستی انھیں حاصل ہے، اسی لیے ہمیشہ ہمیش کی ذلت ومسکنت کے باوجود وہ عارضی طور پر ''معزز'' معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ ''بحبلٍ من الناس'' کے سایہ میں ہیں، اور فرمایا گیا تھا کہ ''حبلٍ من اللہ'' یا ''حبلٍ من الناس'' کا سایہ ان پر پڑے گا تو ہو سکتا ہے کہ کبھی انھیں (عارضی) ''عزت'' ملے۔

''أموال'' کی قوت کے بدولت ان کی حمایت میں باہر کی فوجیں بھی ہوں گی، یہ بھی قرآن کریم کا اعلان ہے، ملاحظہ ہو: کس صفائی کے ساتھ قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿وجعلناکم أکثر نفیراً﴾ (اور ہم نے تمھارے لیے ''نفیر'' (کی طاقت) زیادہ رکھی)۔ ''نفیر'' کہتے ہی ہیں اس فوج کو جو باہر سے مدد کے لیے لائی جائے۔ قرآن کی اس معجز بیانی پر بھی تاریخ نے مہر ثبت کر دی۔

نافرمانی اور تمرد وسرکشی کے نتیجے میں ان کا جو مزاج بنا، اسی نے انھیں دنیا کی ہر تخریبی کارروائی کے پیچھے لا کھڑا کیا، ان کی نام نہاد مذہبی کتاب تلمود نے انھیں تشدد کا خوگر بنایا، فلسفۂ یہودیت (یعنی تلمود کی تعلیمات) کی تطبیق کے لیے سرگرم صہیونیت کی ایک شاخ ''ابناءِ میثاق'' (B'nai Birth) ہی تھی جس نے دنیا کو جنگ عظیم اول کی آگ میں دھکیلا، اور دوسری جنگ عظیم کی آگ بھڑکانے میں بھی اسی کا ہاتھ رہا۔ اس طرح سے ناقابل تلافی نقصانات والی دو عظیم جنگوں کا زخم بیسویں صدی کو دینے کا ''سہرا'' بھی یہودیوں کے سر جاتا ہے۔ یہ سب ﴿ولتعلُنّ علوّاً کبیراً﴾ کی تشریحیں نہیں تو اور کیا ہیں؟!۔ ہر جنگ کے پیچھے یہی۔ ہر فتنہ کے پس پشت یہی۔ امن کونسلوں پر بھی انھیں کا قبضہ۔ اقوام متحدہ بھی انھیں کے زیر سایہ۔ عالمی مالیاتی فنڈ کی کنجیاں بھی انھیں کے پاس۔ تعلیم اور نظام تعلیم کے ذریعے سرد جنگ اور ''غزوفکری'' کے پیچھے بھی انھیں کے خفیہ ہاتھ۔ فوجی کارروائیاں بھی انھیں کی کوششوں کا نتیجہ۔

جب صورتحال یہ ہے تو پھر کیوں بعض مفسرین کے مطابق ان کے فساد کے دونوں موقعوں کو ہم بعثت نبوی سے قبل شمار کر لیں؟ ان مفسرین کی مجبوری یہ تھی کہ ان کی تحقیق بھی یہی تھی، اور ان کے زمانہ تک تاریخی دو بڑے موقعے ہی سامنے آئے تھے۔ مگر قرآن کریم تو ایک زندہ کتاب ہے، اور بنی اسرائیل کا جس انداز میں قرآن کریم نے ذکر کیا ہے اس انداز بیان سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی شرانگیزیاں اور ریشہ دوانیاں بعثت نبوی کے بعد بھی جاری رہیں گی بلکہ کچھ زیادہ ہی، اس لیے کہ یہی ایک امت ایسی ہے جو نزول قرآن سے قبل بھی روئے زمین پر تھی، اور نزول قرآن کے بعد بھی روئے زمین پر موجود ہے۔ ان کے لیے قرآن کریم کے استعمال کیے ہوئے صیغے بھی یہی بات بتاتے ہیں۔ ﴿یریدون أن یطفؤا نور اللہ بأفواههم﴾ میں ''یریدون'' کے صیغے

کا عموم اور پھر اس کے لیے فعل مضارع کے استعمال میں پوشیدہ بلاغت کا پہلو بھی واضح کر رہا ہے کہ نورِ خدا کو بجھانے کے لیے اعداءِ اسلام کی کوششیں ہر زمانہ میں جاری رہیں گی، اور ظاہر ہے کہ ان دشمنوں میں یہود پیش پیش ہیں۔

دوسری سرکشی و بغاوت اور پھر ان کے فیصلہ کن انجام اور آخری تباہی کو بیان کرنے کے لیے لفظ استعمال کیا گیا ہے ﴿فاذا جاء وعد الاخرة﴾، عربی زبان اور لغت کی رو سے ﴿الآخرة﴾ اس دوسرے موقع کو کہتے ہیں جس کے بعد پھر تیسرا موقع نہ آئے، ''الثانية'' اور ''الآخرة'' میں یہی فرق ہے، ''الثانية'' جب بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر اس کا تیسرا چوتھا پانچواں موقع بھی آسکتا ہے، اس کے برعکس ''الآخرة'' دوسرے اور آخری موقع ہی کے لیے بولا جائے گا۔ اسی لیے عالم آخرت کو ''الآخرة'' کہا گیا کہ دنیا کے بعد اس کا نمبر آئے گا، اور اس کے بعد پھر کوئی عالم نہیں ہوگا۔

جہاں سورہ کے شروع میں ''وعد الآخرة'' کہہ کر یہودیوں کے انجام اور آخری تباہی کا ذکر کیا گیا ہے وہیں سورہ کے آخری رکوع میں بھی ﴿وعد الآخرة﴾ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ﴿فاذا جاء وعد الآخرة جئنا بكم لفيفاً﴾ (پھر جب آخری وعدہ کا وقت آئے گا تو ہم تم سب کو سمیٹ کر لے آئیں گے)۔ اکثر مفسرین اس وعدہ کو آخرت کے ساتھ خاص کر دیتے ہیں، اور ترجمہ کرتے ہیں کہ جب آخرت کا یعنی قیامت کا وعدہ آئے گا.....، لیکن دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ سورہ کے اخیر میں جو ''وعد الآخرة'' ہے یہ وہی ''وعد الآخرة'' ہے جس کی طرف شروع سورہ میں اشارہ کیا گیا ہے، آخرت میں تو صرف بنی اسرائیل کیا؟ بلکہ سب کو خدا کے حضور حاضر ہونا ہے، رنگ و نسل کے تمام امتیازات ختم کر کے وہاں ہر کسی کو حاضر کیا جائے گا، اور بدعملیوں کے متعلق باز پرس ہوگی۔ مگر جب شروع سورہ اور اخیر سورہ کی دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو اس کا مفہوم یہودیوں سے متعلق ہوگا کہ اس دوسرے اور آخری وعدہ کے موقع پر اے یہودیو! جب تمہاری تباہی کا وقت آئے گا' تم سب دنیا بھر سے سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیے جاؤ گے، پھر تمہاری خبر لے لی جائے گی۔ ''لفیف'' کہتے ہیں اس جماعت کو جس میں تمام جنسوں اور تمام رنگوں کے لوگ موجود ہوں۔ یہودیوں کی موجودہ صورتحال اور سرزمین قدس میں ان کی آبادی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا بھر کا یہ کوڑا آہستہ آہستہ ایک جگہ جمع کیا جا رہا ہے، رنگوں کے امتیازات مٹائے جا رہے ہیں، ان آباد ہونے والے یہودیوں میں کالا بھی ہے گورا بھی، امیر بھی ہے غریب بھی۔ الغرض سب کو ایک جگہ جمع کر کے اس آخری جنگ کی تیاری ہو رہی ہے جو اہل ایمان اور یہودیوں کے بیچ ہونی ہے، اور اس کے بعد اہل ایمان کو فتح ہوگی، اور قدس کی پاکیزہ و مقدس سرزمین ان نجاستوں سے پاک کر دی جائے گی۔ احادیث کی پیشین گوئی کے مطابق نوامیس فطرت بھی بدلے جائیں گے، قدرت الٰہی کا ظہور ہوگا، درخت درخت کہے گا: یہ میرے پیچھے یہودی کھڑا ہے، آؤ، اس کو کیفر کردار تک پہنچاؤ۔ الصادق المصدوق کی زبان سے نکلی ہوئی ان پیشین گوئیوں کو عالم ظہور میں آنا ہے، کیوں کہ ابھی تک تاریخ اسلام میں بلا واسطہ یہودیوں سے کوئی جنگ ایسی نہیں ہوئی ہے کہ جس میں براہ راست یہود مد مقابل رہے ہوں اور اہل ایمان کو ان پر شاندار فتح نصیب ہوئی ہو اور یہودیوں کے پرخچے اڑا دیے گئے ہوں کہ اس صورت میں زبان نبوت کی ان بشارتوں کو اس پر منطبق کیا جا سکتا تھا! اس لیے لامحالہ ابھی اس آخری جنگ کا ظہور باقی ہے۔

﴿جئنا بكم لفيفاً﴾ سے قبل اسی آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿وقلنا من بعده لبني اسرائيل اسكنوا الأرض﴾ (اور ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ (اس پوری) زمین کو اپنا مسکن بنالو)، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بنی اسرائیل کے علاوہ اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری جو پوری زمین کو اپنا مسکن بنا چکی ہو، اور روئے زمین پر پھیلی رہی ہو۔ دنیا کے ہر خطہ میں یہ قوم آباد رہی ہے، مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر رہنا خدا کی طرف سے ان پر عذاب تھا (وقطّعناهم في الأرض أمماً)۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہودی جہاں بھی رہتے ہیں اپنا ایک الگ محلّہ ضرور بنا لیتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر کسی خطہ میں لاکر چند یہودیوں کو بسا دیا جائے اور وہاں سو سال کے بعد جا کر دیکھا جائے تو ضرور ان کا ایک الگ محلّہ نظر آجائے گا۔ دوسری جتنی بھی قومیں ہیں وہ مرور ایام کے بعد ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں مگر یہود ایک ایسی قوم ہے کہ کبھی دوسری قوموں کے ساتھ گھل مل نہیں سکتی، کیوں کہ یہ ان کا مقدر ہی نہیں، قرآن کا صاف اعلان ہے: ﴿وقطّعناهم في الأرض أمماً﴾ (اور (ان کی خرد ماغی کی پاداش میں) ہم نے انھیں ٹکڑوں میں بانٹ کے رکھ دیا)۔ اور اسی قرآن کا کہنا ہے کہ جب ان کی آخری تباہی کا وقت آئے گا تو سب ایک جگہ جمع کر دیے جائیں گے۔ یہ خدا کا فیصلہ تھا کہ ان کو ٹکڑوں میں بٹ کر رہنا ہے۔ اور یہ بھی اسی کا فیصلہ ہے کہ سرکشی اور بغاوت کی پاداش میں ان کی اینٹ سے اینٹ بجانے، اور بالآخر ان کے خاتمہ کا جب وقت آئے گا تو رنگ و جنس کے تمام اختلافات کے باوجود ان سب کو ایک جگہ سمیٹ دیا جائے گا، اور پھر ان کی چولیں ہلا دی جائیں گی، ان کی شرانگیزیوں کی انھیں خوب سزا دی جائے گی، اور آخرت سے قبل اس دنیا میں ہی انھیں کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے گا، ﴿فاذا جاء وعد الآخرة جئنا بكم لفيفاً﴾ (پھر جب آخری وعدہ کا وقت آئے گا تو ہم تم سب کو سمیٹ کر (ایک جگہ) حاضر کریں گے)۔

قدس کی مبارک سرزمین نے ان تمام اسلامی فتوحات اور فیصلہ کن جنگوں کا بھی نظارہ کیا ہے جن کے بعد اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ کفر و ایمان کے مابین تمام تاریخی معرکہ آرائیاں اور فیصلہ کن جنگیں اس بات کی دلیل ہیں کہ آخری فیصلہ کن معرکہ بھی اسی سرزمین پر ہوگا جو حق و باطل کی رزم گاہ رہی ہے۔ قرآن کا بھی یہی کہنا ہے، اور حدیث شریف بھی یہی بتاتی ہے۔ حق و باطل کی آویزش کبھی ختم ہونے والی نہیں! اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان بلاشبہ ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ ہونی ہے! یہودیوں کے مقابلہ پر اہل ایمان اس آیت قرآنی اور بشارت ربانی سے خوش خبری حاصل کریں: ﴿وإذ تأذّن ربّك ليبعثنّ عليهم إلى يوم القيامة من يّسومهم سوء العذاب﴾ (اور اس وقت کو یاد کرو جب تمھارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے لوگوں کو مسلّط رکھے گا جو ان کو بڑی بڑی تکلیفوں میں مبتلا رکھیں گے)۔

ارض فلسطین

ماضی اور حال کے آئینہ میں

محمد نفیس خاں ندوی

اس وقت عالم اسلام اپنے طول وعرض میں جن سیاسی مسائل سے دوچار ہے ان میں سرفہرست ارض فلسطین کا مسئلہ ہے، جو مختلف نبیوں کی دعوت وارشاد کا مرکز رہی ہے، اور خاص کر وہ جگہ جو انبیاء واولیاء کا معبد ومسکن ہونے کی وجہ سے نہایت بابرکت سمجھی جاتی ہے، اور جسے ''بیت المقدس'' کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ'' Too small geography but too big a history'' یعنی جغرافیائی اعتبار سے تو مختصر ترین لیکن تاریخی اعتبار سے طویل ترین۔ یہ سرزمین یہود، عیسائی اور مسلمان سب کے نزدیک اہمیت کی حامل ہے، اور ہر ایک کا اس سے نہ صرف تاریخی بلکہ جذباتی اور روحانی رشتہ بھی ہے، یہ رشتہ اتنا گہرا اور مضبوط ہے کہ اس سرزمین کی تولیت کو لے کر خون کی ندیاں بہتی رہی ہیں، یہ زمین ایک طویل مدت سے لہولہان ہے، انبیاے کرام جن کی بعثت کا مقصد انسانیت کی فلاح تھا، جو امن عالم کے نقیب تھے، ان سے منسوب اس زمین کو تو امن وآشتی کا گہوارہ ہونا چاہیے تھا، لیکن دنیا میں شاید ہی کوئی اور خطہ ہو جہاں مذہب کے نام پر اتنی جنگیں لڑی گئی ہوں، اور کشت وخوں کا اس قدر بازار گرم کیا گیا ہو!!

آثار قدیمہ کے انکشافات اور تاریخی دستاویزات کی روشنی میں فلسطین کی تاریخ چھ ہزار سال پرانی ہے، اس کو کنعانیوں اور یبوسیوں نے بسایا تھا جو کہ عرب تھے، حضرت ابراہیمؑ ہجرت کرتے ہوئے یہیں آکر آباد ہوئے تھے، یہیں ان کے فرزند عزیز حضرت اسحٰقؑ نے ایک مسجد کی بنیاد رکھی تھی (جہاں اب مسجد اقصیٰ واقع ہے) ان کی دعوت وتبلیغ کا مرکز بھی یہی سرزمین تھی، انبیاء کرام حضرت اسحٰقؑ کی ہی نسل میں مبعوث ہوتے رہے، ان کی اولاد اور خاص کر حضرت یعقوبؑ بھی اسی سرزمین میں کلمۂ توحید کی صدا لگاتے رہے اور راہ راست سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو خدائے واحد سے جوڑتے رہے، چونکہ حضرت یعقوبؑ کا تاریخی نام ''اسرائیل'' بھی تھا (جس کے معنی ہیں اللہ کا بندہ) اسی لیے بعد میں ان سے چلنے والی نسل ''بنی اسرائیل'' کے نام سے پہچانی گئی، بنی اسرائیل کو اللہ رب العزت نے خوب نوازا تھا، اس وقت روئے زمین پر تنہا یہی نسل توحید کی پاسدار اور خدائے واحد کی بندگی کرنے والی تھی اس لیے اس کو ساری دنیا پر برتری وافضلیت عطا کی گئی، حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں میں سے ایک کا نام یہودا تھا، جن کی اولاد ''یہودی'' کہلانے لگی، رفتہ رفتہ یہودیت نے ایک خاص فرقہ اور ایک خاندانی مذہب کا رنگ اختیار کرلیا، عقائد میں من چاہی تبدیلیاں کی گئیں، حلال وحرام کے سارے پیمانے بدل دیے گئے، تورات میں تحریفات کردی گئیں، گویا ایک نیا مذہب سامنے آگیا، اور انبیاء کرام کی برکت اور اللہ کے حضور ان کی عبدیت کے نتیجہ میں جو ایک خاص مدت تک اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کو نوازا تھا، اس کو ان یہودیوں نے اپنا پیدائشی حق سمجھ لیا اور خدا کے انعامات کو اپنے لیے ہی لازم سمجھ لیا، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ان کو ساری دنیا پر فضیلت اور برتری ہمیشہ کے لیے حاصل ہے، اب ان کے کرتوت چاہے جیسے ہوں! لیکن خدا کا انعام اپنے سبھی نیک بندوں کے ساتھ رہتا ہے، اس میں نہ کسی نسل کا امتیاز ہے نہ کسی نبی کی نسبت ہی بنیاد ہے، اس حقیقت کو سمجھنے کے بجائے انھوں نے خود کو اللہ کا بیٹا اور ساری دنیا کو حقیر ترین مخلوق سمجھ لیا، نتیجتاً خدا کی لعنت اور دنیا کی پھٹکار کا شکار ہوئے اور اس پر بجائے توبہ واستغفار کرنے کے وہ بغاوت پر آمادہ ہوگئے اور اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کی بات ماننا تو درکنار ان کو اذیتیں پہنچانے لگے، حتیٰ کہ ان کی جان کے درپے بھی ہوگئے، اللہ نے بھی ان کو دنیا میں رسوا کردیا، ان کی فطرت ہی مسخ کردی، ان پر ذلت ومسکنت تھوپ دی اور صدیوں تک وہ دنیا بھر میں دربدر بھٹکتے رہے، مختلف یورپین ممالک میں یہ آباد رہے، لیکن ہر ملک ان کی گھٹیا حرکتوں، ان کی مکاری، جعل سازی، فتنہ پروری اور احسان فراموشی سے تنگ آچکا تھا آخر کار ان ممالک کو چھٹکارہ کی روشنی ارض فلسطین سے پھوٹتی ہوئی دکھائی دی، یہودیوں کے اپنے ''قومی وطن'' کا صور پھونک دیا گیا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی فلسطین پر بنی اسرائیل کا تاریخی حق ہے لہذا ان کو یہاں آباد ہونے دیا جائے اور پھر چھوٹی چھوٹی بستیاں بسائی گئیں اور پھر ان بستیوں کے بطن سے ''اسرائیل'' نام کی ایک ایک وسیع ترین مملکت سامنے آئی جس نے فلسطین کے اہم اور زرخیز خطہ کو ہڑپ کرلیا۔

واضح رہے کہ اس سرزمین سے جس عقیدت اور تاریخی حق کا دعویٰ یہودی کرتے ہیں اس سے کم پر عیسائی بھی راضی نہیں ہیں، ان کے دعوے کے مطابق حضرت عیسیٰ یہیں یروشلم میں پیدا ہوئے، یہیں پروان چڑھے، یہیں ارشاد وتبلیغ کرتے رہے، ان کے سارے معجزے یہیں ظاہر ہوئے، ان کا مشہور وعظ بھی یہیں کوہ زیتون پر ہوا تھا اور پھر اسی سرزمین میں انھیں صلیب

تک پہنچادیا گیا، اسی وجہ سے یہ سرزمین ان کے نزدیک مقدس ترین ہے، چنانچہ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے تقریباً ایک ہزار سال بعد اس سرزمین کو مسلمانوں سے حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کی، اور پھر آغاز ہوا خونیں صلیبی جنگوں (Crusades) کا، آخر کار 1099ء میں عیسائیوں نے یروشلم کو فتح کیا، اور وہاں لاکھوں مسلمانوں کا قتل کیا، مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب عیسائی فاتحین یوروشلم میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے ٹخنوں تک خون ہی خون تھا۔ 1187ء میں مرد مجاہد صلاح الدین ایوبیؒ کے ناقابل فراموش کارناموں سے مسلمان دوبارہ فلسطین کی تولیت کے مالک ہوئے، لیکن اب 14 مئی 1948ء میں فلسطین کے قلب میں ''مملکت اسرائیل'' کا ایک زہریلا خنجر گھونپ دیا گیا ہے جس سے رستا ہوا خون تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا ہے، اور یہ مقدس سرزمین اپنے ہی باشندوں کے لیے تنگ ہوتی جارہی ہے۔

اس سرزمین کے ساتھ یہودیوں کی ایک طویل، اہم اور عبرتناک تاریخ وابستہ ہے، یہودیوں کو جب حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ فرعون سے نجات ملی اور وہ مصر سے نکل کر صحرائے سینا پہنچے تو انھیں باقاعدہ شریعت عطا کی گئی، موسیٰؑ نے خیمہ کی شکل میں ان کے لیے عبادت گاہ بنائی، تورات میں اس خیمہ کا ذکر 'خیمۂ اجتماع'، 'مقدس مسکن' اور 'شہادت کا خیمہ' ہے، حضرت موسیٰ نے ایک خاص قسم کا صندوق بھی بنایا تھا جس میں تورات کی الواح کو محفوظ کردیا گیا، توارت میں یہ ''عہد کا صندوق'' کہلاتا ہے۔ اس متحرک اور قابل انتقال عبادت گاہ کا حکم صحرائے سینا میں عارضی قیام اور مسلسل نقل مکانی کی وجہ سے دیا گیا (یہ عارضی قیام اور مسلسل نقل مکانی درحقیقت ان کی بدبختی اور سرکشی کی سزا اور اللہ کا حکم نہ ماننے اور بچھڑے کے آگے سجدہ کرنے کا خمیازہ تھا) ۱۴۵۰ ق م میں حضرت یوشع بن نونؑ کی قیادت میں بنی اسرائیل بیت المقدس میں داخل ہوئے اور پھر تقریباً چار سو سال تک وہاں آباد مختلف نسلی گروہوں سے لڑنے اور انھیں پسپا کرنے میں مصروف رہے، اس پوری مدت میں خیمہ کو ہی معبد کا درجہ حاصل رہا، آخر حضرت داؤدؑ کی قیادت میں بنی اسرائیل وہاں پر ایک مستحکم حکومت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے، حضرت داؤدؑ خیمہ کی جگہ ایک عبادت گاہ تعمیر کرنا چاہتے تھے، ان کی وفات کے بعد حضرت سلیمانؑ نے اس کی تکمیل کی اور ایک شاندار عبادت گاہ تعمیر کرائی جو تاریخ میں ''ہیکل سلیمانی'' (Solomon's Temple) کے نام سے معروف ہے، اس کی تعمیر ۹۵۰ ق م میں مکمل ہوئی، اپنی شان وشوکت اور جاہ وشکوہ کے لحاظ سے یہ عمارت عجائبات عالم میں شمار ہوتی تھی، ارض فلسطین پر یہودیوں کی یہ حکومت اللہ کی طرف سے بہت بڑا انعام تھا، لیکن ابھی اس نعمت پر دو صدی بھی نہ گذری تھی کہ یہودی اجتماعی طور پر شرک میں مبتلا ہوئے، شریعت کی تعلیمات کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا، اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہوئے، اور عناد وسرکشی پر آمادہ ہوگئے، نتیجتاً ان سے یہ نعمت چھین لی گئی، اور پھر فلسطین پر بابل کا بادشاہ بخت نصر نے حملہ کیا، ہیکل سلیمانی کو جلا کر برباد کردیا، خزانے لوٹ لیے اور بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بابل لے گیا، ڈیڑھ سو سال کی غلامی کے بعد ایران کے بادشاہ سائرس (Cyrus) نے بابل پر حملہ کرکے یہودیوں کو آزادی دلائی اور انھیں پھر سے فلسطین جاکر آباد ہونے کی اجازت دی، یہودیوں نے دوبارہ ہیکل (Second Temple) کی تعمیر کی، اس دوران اس سرزمین پر مختلف جنگیں لڑی جاتی رہیں، رومیوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجائی، سکندر اعظم نے بھی اس کو تہس نہس کیا، بالآخر ۷۰ ق م سے ۶۳ م تک یہودی خارجی حملوں سے مامون رہے لیکن اس بیچ بھی وہ آپس میں لڑتے رہے، اپنے انبیاء کو قتل کرتے رہے، حضرت عیسیٰؑ کی تکفیر کی اور ان کو سولی تک پہنچادیا۔ ۶۶ء میں یہودیوں نے رومی حکومت کے خلاف بغاوت کی جس کو کچلنے کے لیے رومی جنرل ٹائٹس (Titus) نے حملہ کیا اور یہودیوں کا قتل عام کیا، ایک دن میں بیس لاکھ یہودیوں کو قتل کیا، زندہ بچ جانے والوں کا یوروشلم میں داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا، اس وقت یہودی پوری دنیا میں بکھر گئے، اس دور کو وہ ''دور انتشار'' کہتے ہیں، ہیکل کو تباہ کردیا، بعد کے دور میں یہ پابندی کچھ نرم ہوئی اور مخصوص حالات میں ان کو یوروشلم میں آنے اور ہیکل کے کھنڈرات کی زیارت کی اجازت مل گئی، ہیکل کی اس دوسری تباہی میں اس کی صرف مغربی دیوار محفوظ رہ گئی تھی جو رفتہ رفتہ یہودیوں کا ''مقام اجتماع'' اور گریہ وزاری کا مرکز بن گئی، اس بنا پر یہ ''دیوار گریہ'' (Wailing Wall) کہلانے لگی۔

۱۳۶ء میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے یوروشلم کو دوبارہ آباد کرکے اس کا نام 'Aelia Capitolina' رکھا، اور ہیکل کی جگہ رومی دیوتا 'Jupiter' کے نام پر ایک عالی شان معبد تعمیر کرایا، چوتھی صدی میں مسیحیت کے روم کے سرکاری مذہب بن جانے کے بعد قسطنطین اعظم نے اس معبد کی جگہ ''کلیسائے نشور'' (Church Of Resurrection) تعمیر کرادیا۔

۶۳۸ء میں مسلمانوں نے یوروشلم کو فتح کیا، اس وقت تک یہ سرزمین حوادث زمانہ کا شکار ہوکر ویران ہوچکی تھی اور ہیکل کے باقی ماندہ پتھروں پر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا تھا، حضرت عمرؓ نے صحابہ کے ساتھ مل کر اس کی صفائی کرائی، اور ہیکل کے جنوب میں نماز کے لیے ایک جگہ مخصوص کردی بعد میں یہاں لکڑی کی ایک مسجد تعمیر کردی گئی، ۶۸۸ء میں اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اسی لکڑی کی مذکورہ سادہ مسجد کی تعمیر نو کرکے اس کے رقبہ کو مزید وسیع کردیا، اب اسلامی لٹریچر میں ''مسجد اقصیٰ'' سے یہی مسجد مراد ہے۔ اسی خلیفہ نے ''صخرۂ بیت المقدس'' کے اوپر ایک شاندار گنبد تعمیر کرادیا جو ''قبۃ الصخرہ'' (Dome Of Rock) کے نام سے معروف ہے۔

مسلمانوں نے اس سرزمین کو اس وقت آباد کیا تھا جب یہ یہود ونصاریٰ کی باہمی کشاکش کے نتیجہ میں ویران پڑی تھی، اور اس وقت یہاں پر

آباد مسلمان وہی عرب ہیں جن کو ہمیشہ باہری اقوام خصوصاً یہودیوں سے جنگیں لڑنی پڑی تھیں۔انھوں نے اس ارض مقدس کو نہ صرف یہ کہ آباد کیا بلکہ انبیاء کی دعوت ومشن کو زندہ بھی کیا۔

اس پوری تاریخ کی روشنی میں فلسطین ایک خالص عربی شہر ہے جس کو دوسری اقوام کے حملوں کا سامنا رہا ہے،تو اب یہ کہاں کا انصاف ٹھہرا کہ وہ قوم جو کسی زمانہ میں اس ملک پر حملہ کرتی رہی، اور ناجائز قبضہ کی کوششیں کرتی رہی،اور تاریخ میں ملی اس کو جزوی کامیابی کو بنیاد بنا کر پورا ملک اس کے سپرد کردیا جائے،اور یہ کہا جائے کہ یہ قوم ایک زمانہ میں اس ملک پر حکمراں ہوئی تھی لہذا آج بھی اس کو حق ہے کہ وہ دوبارہ اس پر حکمرانی کرے؟!اگر اس پوری مدت کو جمع کیا جائے جو یہودیوں نے حملے کرتے اور تباہی پھیلاتے ہوئے فلسطین میں گذاری تو اتنی مدت بھی نہیں بنے گی جتنی انگریزوں نے ہندوستان میں یا ہالینڈیوں نے انڈونیشیا میں گزاری،اور اگر غربت کی حالت میں ایک طویل عرصہ کسی علاقہ میں گذارنے سے اس زمین پر ملکیت کا حق بنتا ہے،اور بالفرض یہی انصاف ہے تو یہودیوں کو چاہیے کہ وہ فلسطین کے بجائے جہاں انھوں نے دوسو سال گزارے مصر کی ملکیت کا مطالبہ کریں جہاں انھوں نے ۴۳۰ سال گذارے،اور اسی طرح مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اندلس کی سرزمین کا مطالبہ کریں جہاں انھوں نے ۸۰۰ برس تک حکومت کی:

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق ہسپانیہ پہ کیوں نہیں حق اہل عرب کا

رہا یہ دعویٰ کہ یہودیوں کو یہ سرزمین اللہ رب العزت کی طرف سے بطور انعام ملی تھی،تو اس سے آج بھی انکار نہیں،آج بھی خدا کی یہ نعمت ان کو دوبارہ مل سکتی ہے لیکن شرط ہے کہ وہ خدا کو راضی کرنے والے کام کریں،انبیاء کرام کو قتل کرنے کی گھناؤنی حرکت پر توبہ کریں،اور جن انبیاء کی تکذیب کی اور ان کی بات ماننے سے انحراف کیا آج ان کی بات مان کر اس پر عمل پیرا ہوں،جن انبیاء کی نسبت سے ان کے لیے یہ سرزمین مقدس ہے ان سب نے کھلے طور پر بتلا دیا تھا کہ انبیاء کا سلسلہ آخری نبی محمد ﷺ پر تمام ہوگا،ان پر ایمان لانا ہر ایک کے لیے لازم ہے،شریعت محمدی ﷺ کے سامنے ساری شریعتیں منسوخ ہیں اور اگر ہم خود بھی ہوتے تو ان پر ہی ایمان لاتے،تو جب یہودیوں نے اپنے انبیاء کی بات نہ مانی اور گویا اللہ رب العزت کے خلاف کھلے طور پر بغاوت کی تو پھر کیسا خدا کا انعام اور ان کی اس سرزمین سے کیسی محبت وعقیدت؟!!

مملکت اسرائیل کا قیام

ٹائٹس کے حملہ کے بعد یہودیوں کو پوری دنیا میں کہیں مضبوط پناہ گاہ نہیں مل سکی،البتہ اپنی جعل سازی اور مکاری کے ذریعہ وہ مسلم حکومت اندلس میں آباد ہوگئے،جہاں انھوں نے مسلم یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم فرانس،اٹلی، برطانیہ کے عیسائی نوجوانوں کو نشانہ بنایا،جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیت دو فرقوں میں تقسیم ہوگئی،ایک حصہ کیتھولک اور دوسرا پروٹسٹنٹ بن گیا،یہودیوں نے پروٹسٹنٹ فرقہ کے ذریعہ سود اور سیکولرازم کو رواج دیا،بینک کا سودی نظام جاری کیا،اور عیسائی حکومتوں کو سودی قرضے دے کر اپنے شکنجہ میں جکڑ لیا،اس طرح فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں آگئی،اس دوران انھیں احساس ہوا کہ ان کا بھی اپنا ملک ہونا چاہیے اور ان کی نظر انتخاب فلسطین پر آکر ٹکی،اور پھر منصوبہ بندی شروع ہوگئی،پہلے انھوں نے فلسطین میں پیسوں سے مکانات اور زمینیں خریدیں،جب ان کی تعداد بڑھ گئی تو دھونس اور زبردستی سے وہاں قبضہ کا سلسلہ شروع کیا،اور مقامی لوگوں کو طاقت کے بل پر بے گھر کرنے اور ان کی جگہ یہودی بستی بنانے آغاز ہوا،فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے میں برطانیہ کا اہم رول رہا ہے،حکومت برطانیہ نے یہودیوں کی خفیہ تنظیم ''جیوش ایجنسی'' کو کھلی چھوٹ دی تھی کہ دوسرے ممالک سے یہودیوں کو لاکر یہاں بسائیں۔

آج امریکہ عیسائیت کے پروٹسٹنٹ فرقہ کا امام ہے اور برطانیہ اس کا ہمنوا،یہی وجہ ہے کہ عراق کے خلاف یہ دونوں ایک ہیں،جبکہ قدیم یورپ ان کے خلاف ہے کیونکہ وہ کیتھولک ہے،کیتھولک ممالک چاہتے ہیں کہ فلسطین میں عیسائی حکومت قائم ہو،جبکہ پروٹسٹنٹ فرقہ یہودی حکومت قائم کرکے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے،اس کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے لیے ضروری ہے کہ ''مسجد اقصیٰ'' اور ''قبۃ الصخرہ'' دونوں کو گرایا جائے، اس کی جگہ ہیکل کی تعمیر ہو،پھر اس میں جو تخت داؤد لاکر رکھا جائے گا اس پر حضرت عیسیٰؑ کی آمد ہوگی۔البتہ تمام تر اختلافات کے باجود یہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ فلسطین سے مسلمانوں کو باہر کیا جائے۔چنانچہ نومبر 1947 میں اقوام متحدہ کی قرارداد کے ذریعہ فلسطین کا 55% حصہ یہودیوں کو دے دیا گیا، اور پھر 14 مئی 1948ء کو برطانیہ اور امریکہ کی ساز باز سے تل ابیب کے مقام پر ''یہودیوں کے قدرتی اور تاریخی حق'' کے طور پر مملکت اسرائیل کے قیام کا اعلان کردیا گیا،اس کے بعد فوج کشی کے ذریعہ اسرائیل کے حدود 78% تک بڑھتے چلے گئے، 1967ء میں اقوام متحدہ نے دو قراردادوں کے ذریعہ اسرائیل کو سابقہ حدود میں جانے کا حکم دیا مگر اس پر کوئی عمل نہ ہوا۔بلکہ ابھی تک یہی نہیں طے ہوسکا ہے کہ اسرائیل کی سرحدیں کیا ہیں؟ بہت سے عرب ممالک اور فلسطینی عوام جو وہاں کے اصل باشندے ہیں سرے سے فلسطین کی تقسیم کو قبول ہی نہیں کرتے،اقوام متحدہ نے فلسطین اور اسرائیل کے درمیان جو سرحدیں کھینچی ہیں ان کو اسرائیل تسلیم نہیں کرتا،اقوام متحدہ کی طے کردہ سرحدیں اور ہیں اور اسرائیل کے زیر قبضہ علاقوں کی سرحدیں کچھ اور،کسی اصول اور قانون کی پرواہ کیے بغیر پورے فلسطین میں دندناتے پھرنے سے ان کی سرحدوں کا نقشہ کچھ اور ہی دکھائی دیتا ہے، اور اسرائیلی حکمرانوں کے عزائم پر مشتمل ''عظیم تر اسرائیل'' (Great Israel) کا جو نقشہ رکارڈ پر موجود ہے وہ ان سب سے مختلف ہے،اس نقشہ کے مطابق اسرائیل کی سرحدوں کو وسیع کرکے اس میں

عراق، شام، لبنان، اردون، فلسطین اور سعودی علاقوں کو شامل کرنا ہے۔

فلسطین کی موجودہ صورت حال

مملکت اسرائیل کے قیام کے بعد صرف یہ نہیں ہو کہ مسلمانا پنی سرزمین سے بے دخل کر دیے گئے بلکہ ان نہتے فلسطینیوں کو ہر طرح سے پریشان کرنے کا سلسلہ چل پڑا، ان کے علاقوں میں جگہ جگہ چوکیاں قائم ہیں، راستہ مسدود کر دیے جاتے ہیں، کرفیو لگا کر گھر گھر کی تلاشی لی جاتی ہے، خواتین کی عصمت تار تار کی جاتی ہے، انھیں بے گھر کر کے کیمپوں میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، مگر ان کیمپوں کو بھی ان کے قبرستان میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، ''جنین'' نامی کیمپ اس کی ایک مثال ہے۔

۱۹۴۷ء کے آخری مہینوں سے لے کر ۱۹۴۹ء کے اوائل تک تقریباً سات لاکھ فلسطینی اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، جس زمین پر وہ رہتے تھے اس کو فلسطین سے اسرائیل میں بدل دیا گیا، بہت بڑی تعداد کو طاقت کے بل پر زمین بدر کیا گیا، اور ایک بڑی تعداد کو اپنی اور اپنے پریوار کی حفاظت کے لیے گھر بار کو چھوڑنا پڑا۔ کچھ نے عراق، کچھ نے لبنان اور کچھ نے شام و مصر کے کیمپوں میں پناہ لی۔ اقوام متحدہ کے مطابق کاغذوں میں اس وقت تقریباً سینتالیس لاکھ فلسطینی کیمپوں میں زندگی گذار رہے ہیں۔

ان کیمپوں میں پانی اور بجلی کی زبردست قلت ہے، خوراک کی انتہائی کمی ہے، زیادہ تر ٹماٹر اور روٹی پر گذارا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے گھنٹوں قطار میں کھڑا رہنا پڑتا ہے، اور بسا اوقات تو وہ بھی نصیب نہیں، فاقہ کشی میں دن گذرتے ہیں، بچوں کی تعلیم کا کوئی نظم نہیں، صفائی ستھرائی کا تو تصور ہی نہیں، علاقے کوڑے کچرے کے ڈھیر سے اٹے پڑے ہیں، اور کمسن بچے ان ڈھیروں میں غذائی اشیاء تلاش کرتے رہتے ہیں، پانی اور بجلی کا بحران ہے، پانی کے نکاسی کے لیے ڈھنگ کا نظم نہیں نتیجتاً بیماریاں بڑھتی جارہی ہیں، اور ڈاکٹروں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ہم مالی وسائل کی کمی کا شکار ہیں، لیکن جب کوئی وی، آئی، پی ان کیمپوں کے دورہ پر آتا ہے تو خاصا اہتمام کیا جاتا ہے، اور ایک دورہ کا خرچ مریضوں کے ایک ماہ کے اخراجات سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے فلاحی اداروں کا دعوی ہوتا ہے کہ وہ پناہ گزینوں پر لاکھوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں حالانکہ ان کی زادہ تر رقم سرکاری دوروں اور پروپیگنڈہ اسکیموں میں خرچ ہوتی ہیں، اور جب ان مریضوں کی دیکھ بھال کی بات آتی ہے تو مالی بحران کو واویلا مچایا جاتا ہے۔

اسرائیل نے صرف فلسطینیوں کے گھر نہیں اجاڑے بلکہ ان سے ان کے جینے کا حق ہی چھین لیا ہے، بچے بچپن کی معصومیت سے محروم کر دیے گئے، عورتوں کی زندگیوں سے عصمت اور حیا جیسے الفاظ کھرچ کر پھینک دیے گئے، نوجوان جوانی کے مفہوم اور اس کے تقاضوں واقف بھی نہ ہو پائے، اور بوڑھے تو بس اپنی زندگی کا بوجھ ڈھو رہے ہیں، ایسی زندگی جس میں زندگی کا کوئی مفہوم نہیں۔

صہیونی انتظامیہ کی طویل عرصہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ فلسطینی مسلمانوں کو محاصرہ کی کیفیت میں رکھا جائے، چنانچہ جو مسلمان فلسطین میں ہی بسے ہیں اور اسرائیل کے ہر ستم کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں ان کی آبادی بھی دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہے، تاکہ ان علاقوں کے فلسطینی آپسی میں کوئی رابطہ نہ رہ سکیں، ان دو حصوں میں سے ایک حصہ ''غزہ پٹی'' کہلاتا ہے، جس کا کوئی بھی جغرافیائی حصہ دیگر فلسطینی علاقوں سے نہیں ملتا، یہ تین سمتوں سے اسرائیل کے گھیرے میں ہے، ایک جانب سمندر ا ہے جہاں پر اسرائیلی بحریہ کے سمندری جہاز نگرانی میں مصروف ہیں۔ دوسرا حصہ دریائے اردن کے مغربی کنارے کا علاقہ ہے، جس میں مقبوضہ بیت المقدس بھی شامل ہے، یہ پورا علاقہ بھی یہودی آبادیوں کے نرغے میں ہے، اگر مسلمانوں کو مسجد اقصی آنا ہو تو ان بستیوں سے ہو کر گذرنا پڑے گا، جو کبھی بھی بند کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ اس سال عید الفطر کے موقع پر ہوا کہ مسلمانوں کو عید کی نماز کے لیے مسجد اقصی جانے سے روک دیا گیا۔

بات یہیں تک محدود نہیں ہے، بلکہ صہیونیت کا وہ خواب جو وہ برسوں سے دیکھ رہی ہے اس کی جانب پیش رفت بھی شروع ہوگئی ہے، اور اس کا پہلا قدم اس طور پر بڑھا کہ مسجد اقصی کے صحن میں ''ہیکل سلیمانی'' نام کا ایک دیو ہیکل ماڈل نصب کر دیا گیا ہے، یہ اس منصوبہ کی جانب پہلا قدم ہے جو صہیونی مسجد اقصیٰ کو منہدم کر کے اس کی جگہ اپنا معبد ہیکل سلیمانی کے نام سے تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ہیکل کی آر میں مسجد اقصی کی بنیادوں میں سرنگیں لگا دی گئی ہیں، مسجد اقصی کا علاقہ زلزلوں کے لیے مشہور ہے، ماضی میں بھی یہاں زلزلے آتے تھے جن سے مسجد کی دیواروں کو نقصان پہنچا تھا، کوئی بعید نہیں کہ صہیونی لابی زلزلوں کے نام پر یہاں جغرافیائی تغیر پیدا کرنے کی کوشش کرے، ایسے میں مسجد اقصی کا اپنی کھوکھلی بنیادوں پر قائم رہنا ناممکن ہو جائے گا، اور یہ سب اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب ان کو یقین ہو چلے گا کہ اب امت مسلمہ میں کوئی صلاح الدین ایوبی اور نور الدین زنگی نہیں بچا۔

مسلمانوں کو عالمی مسائل میں اس حد تک الجھا دیا گیا ہے کہ کسی کو مکہ مکرمہ کے ائمہ کی وہ اپیل دیکھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا ہوگا جو انھوں نے اس سلسلہ میں مسلمانان عالم سے کی ہے کہ قبلہ اول کی حفاظت کے لیے تمام دینا کے مسلمان جاگ جائیں، رابطہ عالم اسلامی کے پلیٹ فارم سے بھی یہ آواز بلند کی گئی کہ سوئے ہوئے مسلمانو! جاگو! شیطانی صہیونیت کے ناپاک ہاتھ مسجد اقصی کے دامن تک جا پہنچے ہیں۔

حالات کے بگاڑ میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں، ہماری بے دینی اور بے حسی نے یہ دن دکھلایا ہے، ہمارے حکمرانوں کی صفوں میں اگر دینی حمیت اور اتفاق ہوتا تو شاید آج تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ پھر بھی ہم مایوس نہیں ہیں، حالات پھر بدل سکتے ہیں، لیکن اس بار شروعات حکمرانوں سے نہیں عوام سے کرنی ہوگی ہم سے اور آپ سے کرنی ہوگی ۔

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے۔